تعلیم القرآن

از: مولانا محمد اویس ندوی مرحوم

بہادری:

یا ایھا الذین آمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفا فلا تولوھم الادبار۔ (انفال۔۱۱)

اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدان جنگ میں مقابل ہو تو ان کو پیٹھ مت دو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب دشمن سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں، پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ دکھائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت بہادر تھے، ایک بار مدینہ والوں کے دل میں کسی طرف سے حملہ کا ڈر پیدا ہوا، حضور اٹھے اور تنہا گھوڑے پر، مدینہ کا چکر لگا آئے اور لوٹ کر فرمایا، ڈر کی کوئی بات نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں بزدلی سے پناہ مانگتے تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ انسان میں سب سے بڑی بد اخلاقی، گھبرا دینے والا بخل، اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے۔

فرمایا، کمزور مسلمان سے، طاقتور مسلمان زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک پیارا ہے!

استقامت:

واستقم کما امرت (شوریٰ۔۲) اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرما دیا۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر مضبوطی سے قائم رہا جائے، مشکلیں پیش آئیں، مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے۔ خباب ابن الارت ؓ ایک صحابی تھے ان کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں، طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں، آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹا دیا گیا اور ایک شخص ان کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے، یہ سب کچھ ہوا، مگر اسلام سے منہ نہ موڑا، حضرت بلال ؓ گرم جلتی بالو پر لٹائے جاتے، پتھر کی بھاری چٹان ان کے سینہ پر رکھی جاتی، گلے میں رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹے جاتے اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ اس وقت بھی ان کی زبان سے اَحَدٌ، اَحَدٌ (ایک خدا، ایک خدا) ہی نکلتا تھا۔

اظہار حق

فاصدع بما تؤمر (حجر۔۶) پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو کھول کر سنا دو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سچی اور حق بات کو صاف صاف کھلم کھلا کہنا چاہیے، لعنت ملامت یا جان و مال کے ڈر سے حق کو چھپانا درست نہیں۔

حضور ؐ نے فرمایا، کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کو انسانوں کے ڈر سے کہنے سے نہ رکے۔

ایک بار آپ ؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے کو حقیر نہ سمجھے! صحابہ ؓ نے کہا یا رسول اللہ ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو کیوں کر حقیر سمجھ سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ اگر خدا کے بارہ میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے ایسے شخص سے خدا قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا انسانوں کا ڈر! خدا کہے گا کہ تم کو سب سے زیادہ مجھ سے ڈرنا چاہیے تھا۔ حضرت ابوذر غفاری ؓ نے جب اسلام قبول کیا تو کفار قریش کے بھرے مجمع میں جا کر توحید کی آواز بلند کی، جب تک مار کھاتے کھاتے بے دم نہ ہو گئے خاموش نہ ہوئے دوسرے دن پھر جا کر حق کا اعلان کیا اور کافروں نے وہی سلوک کیا۔

محسنِ انسانیت ؐ نے فرمایا

خشیت الٰہی: عبداللہ بن شخیر سے روایت ہے کہ آپ برابر مغموم رہتے تھے۔ کسی وقت آپ کو چین نہ تھا (یہ کیفیت فکر آخرت سے تھی) اور دن بھر میں ۷۰ یا ۱۰۰ بار استغفار فرماتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ یا تو تعلیم امت کے لیے تھا یا خود امت کے لیے مغفرت طلب کرنا مقصود تھا یا یہ وجہ تھی کہ آپ دریائے قرب و عرفان میں مستغرق رہتے تھے اور آناً فاناً ترقی کرتے رہتے تھے۔ کیونکہ تجلیات متجدد ہوتی رہتی ہیں اور تجلی حسب استعداد محل تجلی ہوتی ہے اور آپ کی استعداد برابر متزائد ہوتی جاتی تھی اس لیے تجلیات بھی لاتقف عند حد (جن کی کوئی غایت نہ ہو) فائز ہوتی تھیں پس جب مرتبہ مابعد کو اعلیٰ دیکھتے تھے تو اپنے کو مرتبہ ماقبل کے اعتبار سے تقصیر کی طرف منسوب فرماتے۔

رقت قلبی: حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نواسی قریب الوفات تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گود میں اٹھا لیا اور اپنے سامنے رکھ لیا۔ حضور ؐ کے سامنے رکھے رکھے ان کی وفات ہو گئی! ام ایمن (جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک کنیز تھیں، چلا کر رونے لگیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا اللہ کے نبی کے سامنے بھی رونا شروع کر دیا؟ (چونکہ آپ ؐ کے بھی آنسو ٹپک رہے تھے اس لیے) انہوں نے عرض کیا کہ حضور بھی تو رو رہے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ رونا ممنوع نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے (کہ بندوں کے قلوب کو نرم فرما دیں اور ان میں شفقت و رحمت کا مادہ عطا فرما دیں) پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن ہر حال میں خیر ہی میں رہتا ہے حتیٰ کہ خود اس کی روح کو نکالا جاتا ہے اور وہ حق تعالیٰ شانہ کی حمد کرتا ہے۔ (شمائل ترمذی)

حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون کی پیشانی کو ان کی وفات کے بعد بوسہ دیا۔ اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو ٹپک رہے تھے۔ (شمائل ترمذی)

رحم و ترحم: ایک دفعہ ایک صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں کسی پرندے کے بچے تھے اور وہ چیں چیں کر رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ بچے کیسے ہیں۔ صحابی ؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں ایک جھاڑی کے قریب سے گزرا تو ان بچوں کی آواز آ رہی تھی میں ان کو نکال لایا۔ ان کی ماں نے دیکھا تو بیتاب ہو کر سر پر چکر کاٹنے لگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، فوراً جاؤ اور ان بچوں کو وہیں رکھ آؤ جہاں سے لائے ہو۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد باب الرحمۃ والشفقۃ علی الخلق۔ معارف الحدیث)

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے وہاں ایک اونٹ بھوک سے بلبلا رہا تھا۔ آپ ؐ نے شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اس کے مالک کو بلا کر فرمایا اس جانور کے بارے میں تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ (ابوداؤد باب رحمت۔ معارف الحدیث)

ایک دفعہ حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو پیٹ رہے تھے، اتفاق سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر تشریف لائے آپ ؐ نے رنجیدہ ہو کر فرمایا،

"ابومسعود! اس غلام پر تمہیں جس قدر اختیار ہے، اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ اختیار ہے"

حضرت ابومسعود ؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک سن کر تھرا اٹھے اور عرض کیا

"یا رسول اللہ میں اس غلام کو اللہ کی راہ میں آزاد کرتا ہوں"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تم کو چھو لیتی"

(ابوداؤد۔ کتاب الادب باب حق المملوک)

تعمیرِ حیات

لکھنؤ — پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر (۱۶) | ۲۵ ستمبر ۱۹۷۹ء | ۲ ذی قعدہ ۱۳۹۹ھ | شمارہ نمبر ۲۲

شرح تعاون

اندرون ملک ——— ۱۶ روپے

فی پرچہ ——— ۸۰ پیسے

بیرون ملک۔ بحری ڈاک۔ جملہ ممالک ۲ پونڈ

ہوائی ڈاک

ایشیائی ممالک ۲ پونڈ

افریقی ممالک ۷ پونڈ

یورپ و امریکہ ۹ پونڈ

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دین و ادب کا خادم، ندوۃ العلماء کا ترجمان، آپکی خدمت میں پہنچتا رہے تو اس کا سالانہ چندہ مبلغ سولہ روپے ارسال فرمائیے۔ اگر اگلے شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا چندہ یا خط موصول نہ ہوا تو یہ سمجھ کر کہ آپ کو وی۔ پی سے چندہ ادا کرنے میں سہولت ہے۔ اگلا پرچہ مع وی پی خرچ ۱۹/۵۰ کے مطالبہ میں وی۔ پی سے روانہ ہوگا۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

آہ ـــ! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

عالم اسلام کے عظیم مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو امریکہ کے ایک اسپتال میں وفات پائی، وہ عالم اسلام کی عظیم شخصیت تھے، فکر اسلامی کی تشریح اور اسلام کے جامع نظام حیات کی توضیح کے سلسلہ میں انہوں نے جو تحریری کاوشیں کیں، ان کا مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے فکری واجتماعی تصورات پر غیر معمولی اثر پڑا۔ ان کی کتابوں کے ترجمے آج عالم اسلام کی تقریباً تمام رائج زبانوں میں ہو چکے ہیں اور دنیائے اسلام میں ان کے افکار و تشریحات کو اسلامی نظریاتی میں اہم مقام حاصل ہو چکا ہے۔

مولانا نے اسلامی ذہن کی رہنمائی اور فکر اسلامی کی موثر تشریح کا جو کارنامہ انجام دیا وہ اس عہد کا ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے، مولانا نے وقت کے ایسے اہم اور سنجیدہ مسائل میں جن میں مغربی فکر و تہذیب نے اپنی ملمع سازی سے نئے تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں کو بہت متاثر کر رکھا تھا اور جن کی وجہ سے نوجوان تعلیم یافتہ نسل کی ذہنی قیادت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر مغربی زعماء و مفکرین کے ہاتھوں میں منتقل ہوتی جا رہی تھی، اسلام کی ایسی علمی تشریح اور وکالت کی جس سے عالم اسلام کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے بہت سے افراد کی ذہنی عقیدت، مغرب کے سحر انگیز افکار کی آفت سے نکل کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئی اور بہت سے ایسے افراد جو اسلام سے برگشتہ ہو چکے تھے اسلام کی اس طاقتور ترجمانی کے باعث اسلام کی آغوش میں دوبارہ آگئے۔

مولانا کی تصنیفات میں سے "الجہاد فی الاسلام"، نے بہت سے بھٹکے ہوئے مسلمان ذہنوں میں تلاطم پیدا کیا پھر مولانا کی کتاب پردہ نے مغربی فکر و تہذیب کے اثر کو کم کر دیا، یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر میں ملک و قوم کے خیر خواہ مغربی استعمار سے سیاسی میدان میں نبرد آزمائی کر رہے تھے، ان کو اس میدان میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہونے کی امید بھی تھی، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و تمدن کے سامنے جدید تعلیم یافتہ ذہن ایسا مرعوب تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے سیاسی میدان میں مسلمانوں کی سیاسی فتح اچھے دور رس نتائج کی حامل نہ ہو سکی کیونکہ تہذیبی و فکری میدانوں میں مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑتا، اور یہ شکست نتائج کے لحاظ سے سیاسی میدان کی شکست سے زیادہ اثر انگیز اور تباہ کن ثابت ہوئی، ایسے وقت میں مسلمان اہل علم و فکر نے اپنے اپنے طریقے سے کوشش شروع کیں، ان میں علامہ شبلی نے اسلام کی تاریخی عظمت کو اپنی تحقیق و تصنیف کا مرکز بنایا پھر ان کے شروع کئے ہوئے کام کو ان کے شاگردوں اور ان کے قائم کئے ہوئے ادارہ دارالمصنفین نے کامیابی اور خوبی کے ساتھ آگے بڑھایا ان میں ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی ؒ کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنی ظریفانہ شاعری کو مغرب سے مرعوب ذہن کی اصلاح کی کوشش کا ذریعہ بنایا، ڈاکٹر محمد اقبال ؒ نے اسلامی تخیل و ذہن کی عظمتوں کو اجاگر کرنے کے لئے اپنی طاقتور شاعری سے کام لیا، اور تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں میں اسلامی خود اعتمادی کا صور پھونکا مولانا ابوالکلام آزاد نے بلند حوصلگی پیدا کرنے کے لئے اپنی سحر انگیز ادیبانہ نثر کا سہارا لیا، لیکن عصر جدید کے ذہن کے مطابق علمی انداز کے ساتھ شستہ و فکر انگیز اسلوب میں اسلامی فکر کی ترجمانی کا کام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے شروع کیا اس کے لئے انہوں نے ایک ماہنامہ "ترجمان القرآن" نکالا اور پھر اپنے نو تشکیل فکری منصوبے کو بروئے کار لانے کے لئے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی، جس میں وہ اہل فکر، اہل دانش شریک ہوئے جنہوں نے مولانا کی ترجمانی کی طاقت و اہمیت کو محسوس کیا۔ ان میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے افراد کی قابل ذکر تعداد تھی اور علم دین کے حاملین کی شرکت بھی تھی۔

طبقۂ علماء میں سے مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی خاص طور پر قابل ذکر تھے ان حضرات نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے کام کی اہمیت و افادیت کو سمجھا تھا اور قدر محسوس کی تھی، در اصل مولانا نے اپنے فکری کام کو جس محاذ سے شروع کیا تھا وہ مغربی فکر و تمدن کے لائے ہوئے فتنوں کے مقابلہ کا محاذ تھا اور اس میں مولانا کے فکری جہاد کا غیر معمولی اثر ہونا شروع ہوا تھا، اور اسی کے ذریعہ مولانا کی صلاحیتوں اور ان کے کام کی اثر پذیری کا دنیا کو اندازہ ہوا، جب کام نے زیادہ منظم شکل اختیار کی تو مولانا نے اپنی فکری کاوشوں کو کئی محاذوں تک پھیلایا، ان میں سے ایک محاذ فقہی و کلامی تھا اور ایک سیاست و اقتدار کا محاذ تھا مولانا نے اپنے اس طریقۂ کار سے عہد حاضر کے لائے ہوئے مسائل کے جواب میں اسلام کو ایک جامع اور مکمل دین اور نظام حیات کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں بعض امور میں وہ علماء اور متعدد اہل علم رفقاء کی تائید برقرار نہ رکھ سکے۔

لیکن مولانا کی ایک عظیم صفت یہ رہی کہ وہ مشکلات کے باوجود اپنے ذہن کے مطابق طے کئے ہوئے نظریہ و نظام کو بروئے کار لانے کے لئے نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ لگے رہے، اس کے نتیجہ میں ان کے فکر نے تھوڑے ہی عرصہ میں عالم اسلام کے بڑے حصہ میں اپنے قدرداں اور ماننے والے بنا لئے، مولانا کی کتابوں کے ترجمے مختلف ممالک میں پھیل گئے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں برصغیر سے باہر بھی خاص طور پر عالم عربی میں مولانا کی فکری رہنمائی کو سراہا گیا، اور ان کی کتابوں سے استفادہ کا شوق بڑھا، اس وقت عالم اسلام کے مختلف خطوں میں نئی تعلیم یافتہ مسلمان نسل مولانا کی عظمت کی بہت معترف ہے۔

مولانا نے عہد حاضر کی جاہلیت پر بڑی تنقید کی اور اسلام و نظام اسلام کو انسانیت کی مشکلات کا صحیح حل بتایا، مولانا نے اس سلسلہ

میں جو اسلوب بیان اور استدلالی انداز اختیار کیا وہ طاقت و اثر سے بھرپور تھا، اس کی زبان و طرز استدلال زمانہ کے ذوق و فہم سے ہم آہنگ تھے۔ اسی لئے ان کی تحریریں اور مضامین بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے رہے، اور ان کا اثر بہت سے موقعوں پر پڑھنے والوں کے ذہنوں کی یکسر تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوا، مغربی افکار و تمدن کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی باریک بینی اور خوش اسلوبی کو بہت تسلیم کیا گیا، اور اس نے ان کے نتائج فکر میں بڑا وزن پیدا کیا، ان کی مایۂ ناز تصنیف "پردہ" نے تو اس کے پڑھنے والوں پر صرف ذہنی اثر ہی نہیں ڈالا بلکہ متعدد لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی بھی پیدا کر دی۔

سیاست و حکومت کے سلسلہ میں اپنے خیالات کو بروئے کار لانے کی جو جدوجہد انہوں نے کی اس نے کچھ ذہنوں میں غلط فہمی پیدا کی اور وہ ان کے متعدد رفقاء کار کے ان سے اختلاف کا سبب بنی، اس طرح دین کے اساسی مسائل کے سلسلہ میں بعض نصوص سے انہوں نے جو مفہوم اخذ کئے ان سے متعدد راسخ العلم علماء کو اتفاق نہیں ہو سکا، اور اس کی وجہ سے طبقۂ علماء سے مولانا کی کشیدگی کی صورت پیدا ہو گئی، مزید برآں مولانا کے ان خیالات کا اثر ان کی تحریک کے چلانے والوں کے یہاں بھی ظاہر ہوا، ان باتوں کی وجہ سے مولانا کی عظیم فکری شخصیت مسلمانوں میں غیر متنازعہ شخصیت نہ بن سکی، مولانا نے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں پر جو اثر ڈالا تھا اور جو اپنی ہمہ گیری اور طاقت کے لحاظ سے بڑی حد تک غیر معمولی تھا اس کو دیکھتے ہوئے مولانا کی شخصیت کا متنازعہ ہونا ایک نقصان کی بات ہوئی، یہ وہ حقیقت ہے جس سے مولانا کے کام کی ہمہ گیری متاثر ہوئی۔

مولانا کے ساتھ اگر یہ تلخ حقیقت نہ ہوتی تو آج مولانا کی عظمت کو خراج ملنے میں اتنی کمی بھی نہ ہوتی جو عالم اسلام کے برگزیدہ طبقے میں نظر آتی ہے۔

مولانا نے اپنی عملی زندگی مقالہ نگاری اور صحافت سے شروع کی تھی اور اسی سے وہ تحقیق و تصنیف کی دنیا میں داخل ہوئے، انہوں نے ۲۴ سال کی عمر میں اپنی معرکۃ الآرا کتاب "الجہاد فی الاسلام" تصنیف کی،

جو مولانا کی فکری قائدانہ صلاحیت کی روشناسی کا باعث بنی، مولانا نے شروع میں جمعیۃ العلماء کے آرگن مسلم اور الجمعیۃ کی اور بعض دیگر رسالوں کی ادارت کی پھر خود اپنا رسالہ "ترجمان القرآن" نکالا جو ان کے افکار و خیالات کا اور ان کی تحریک کا اعلیٰ ترجمان تھا اور برابر جاری ہے۔ یہ رسالہ مولانا نے حیدرآباد کے قیام کے دوران نکالا تھا پھر جب مولانا نے نقل سکونت اختیار کی اور پنجاب کو اپنا مرکز بنایا تو وہ رسالہ بھی وہاں منتقل ہوا۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا کو قادیانیت مخالف تحریک کے زمانہ میں حکومت کی طرف سے پھانسی کی سزا سنائی گئی، مولانا نے اس کو بہت صبر و رضا کے ساتھ سنا اور جان جان آفریں کے سپرد کرنے کے لئے تیار ہو گئے، یہ سزا نافذ نہیں ہوئی لیکن مولانا کی استقامت و رضا بالقضا کے عمل نے ان کی شہرت اور ناموری میں بہت اضافہ کیا اور یہ راہ خدا میں ان کے جہاد و قربانی کا ایک عمل سمجھا گیا۔

مولانا کی زندگی اسلام کے خادموں کے لئے بہت سے سبق اور بہت سے پہلوؤں میں نمونہ رکھتی ہے، مولانا کی ابتدائی زندگی کے حالات نے ان کو سہولت کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھنے اور بڑا علمی مقام پیدا کرنے میں مساعدت نہیں کی تھی لیکن مولانا نے محنت و تندہی سے وہ مقام حاصل کیا جو مساعد حالات میں بھی کم حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مولانا نے اسلامی افکار و خیالات کی تفہیم و تشریح کے لئے جو اسلوب تحریر اختیار کیا وہ مدلل، سلیس اور موثر و دل نشیں تھا اس میں عصر حاضر کے ذہنوں کو متوجہ و متاثر کرنے کی پوری صلاحیت اور لحاظ تھا، مولانا کا یہ اسلوب صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں رہا بلکہ ان کے ماننے والوں اور عقیدت رکھنے والوں نے اس کو اپنایا اور وہ ان میں رائج ہوا، ان کے ماننے والوں میں سے نہ معلوم کتنے ہیں جن کا تحریری انداز مولانا کے تحریری انداز سے خاصا مشابہ ہو چکا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی تعلیم و تربیت جس انداز میں ہوئی، وہ عصر جدید کے ذہن و ذوق اور جدید زندگی کے تقاضوں کے سمجھنے کی صلاحیت میں ممتاز

اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کی صلاحیت سے مماثل تھی چنانچہ مولانا مدظلہ کے مولانا مرحوم سے دس سال چھوٹے ہونے کے باوجود مولانا مدظلہ نے نوجوانی کے زمانہ میں مولانا مرحوم کے اسلوب و بیان سے قرب محسوس کیا تھا اور اس کے نتیجہ میں مولانا مرحوم کے کام میں کچھ تعاون بھی کیا تھا بعد میں اگرچہ دونوں نے کام کے لئے علیحدہ علیحدہ خطوط اختیار کئے لیکن نئی نسل کے ذہنوں کو مطمئن کرنے والے اسلوب کو اختیار کرنے میں اور عصر حاضر کی ضرورت کا لٹریچر مہیا کرنے میں دونوں میں تقارب رہا، اور دونوں اس سلسلہ میں ایک دوسرے کے قدرداں بھی رہے، اسی لئے مولانا مودودی کی وفات کے اس سانحہ کو مولانا مدظلہ

نے بہت محسوس کیا، دونوں حضرات عالم اسلام کے متعدد عالمی اداروں کے رکن اساسی تھے مولانا مرحوم جب تک صحت اجازت دیتی رہی ان میں شرکت کرتے تھے، آخر کے برسوں میں گردوں اور گھٹنوں کی تکلیفات کی وجہ سے سفر ترک ہو گئے تھے مولانا کا سفر امریکہ دو تین ماہ قبل ان کے ایک صاحبزادہ کی خواہش پر جو کہ خود ڈاکٹر ہیں اور امریکہ میں ہیں برائے علاج ہوا لیکن خدا کی مرضی تھی کہ مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اس طرح ۷۶ سال کی عمر میں جس میں سے ۵۰ سال سے زیادہ مدت مولانا نے اسلام کے دفاع و تشریح میں صرف کی تھی مولانا اپنے خالق سے جا ملے، اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

اہل قلم حضرات سے!

ادارہ "تعمیر حیات" نے مولانا سید محمد الحسنی کی وفات کے بعد تعمیر حیات کے "محمد الحسنی نمبر" کا اعلان کیا تھا اور اس کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں لیکن قضائے الٰہی کہ اس کے بعد اڈیٹر تعمیر حیات خود وفات پا گئے، ان کے بعد مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کا حادثۂ ارتحال ندوہ اور کارکنان تعمیر حیات کے لئے بڑا اندوہ ناک تھا، ان حادثات کی وجہ سے خاص نمبر موخر ہی ہوتا چلا گیا۔

ادارہ قارئین کرام اور اہل قلم حضرات سے اس غیر معمولی تاخیر پر معذرت خواہ ہے، اور ان تینوں مرحومین کے علم و فضل اور ان کی دینی و ملی خدمات کو محفوظ کرنے اور انکی یادیں تازہ رکھنے کے لئے،

- مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی
- مولانا سید محمد الحسنی
- مولانا اسحاق جلیس ندوی

پر خصوصی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے، اس میں ان شاء اللہ ان تینوں حضرات کے علم و فضل، کمالات، خصوصیات، خدمات اور ان کی سیرت و شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والے مضامین شامل ہوں گے۔ اس خصوصی اشاعت کی تیاریاں شروع ہیں۔ اہل قلم حضرات سے گذارش ہے کہ اپنے نگارشات (نظم و نثر) پہلی فرصت میں ارسال فرمائیں۔

(ادارہ)

بقیہ ص ۱۶: ندوہ کے شب و روز

صورت میں نظر آتے ہیں۔ طلباء کو نظر آتا تھا کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ وہ جس شاہراہ پر جا رہے ہیں اس کی انتہائی منزل کہاں ہے ان کو معلوم تھا کہ مذہب کا روحانی اثر کس قدر قوی ہے، ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ کون سا پرزور ہاتھ ان کو دھکیل رہا ہے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

ذاتی واقفیت، تعلّقات اور خط و کتابت

کی روشنی میں

● مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

مولانا مودودی کے حادثۂ وفات کی اطلاع آئی تو مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مسلم مجلس مشاورت کے جلسہ منعقدہ ۲۲-۲۳ ستمبر میں شرکت کے لئے دہلی گئے ہوئے تھے، ان کی واپسی ۲۴ ستمبر ۱۹۷۹ء پر ادارہ "تعمیر حیات" نے اس حادثۂ فاجعہ پر ان کے تاثرات اور مولانا مرحوم کی شخصیت و خدمات کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کئے، تو انہوں نے حسب ذیل مفصل بیان دیا جو تعمیر حیات کی اس اشاعت میں بجنسہ درج کیا جاتا ہے۔

(مدیر)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی رحلت کی خبر مجھے ۲۳ ستمبر ۱۹۷۹ء یکشنبہ کو صبح دہلی میں ملی، میں مسلم مجلس مشاورت کے جلسہ میں شرکت کے لئے دہلی گیا ہوا تھا، شب میں جب ہم لوگ جلسہ سے فارغ ہو کر اٹھے تو ایک دیرینہ کرم فرما نے جو جماعت اسلامی کے پرانے رکن اور عہدہ دار ہیں، ریڈیو پاکستان کے حوالہ سے ان کی علالت کے نازک شکل اختیار کر لینے کی اطلاع دی اور دعا کے لئے کہا، میں تفصیلات سے بے خبر تھا، واقعہ یہ ہے کہ طبیعت پر اس کا اثر پڑا، یہ ہفتہ کے روز کا واقعہ ہے، شب ہی میں ان کے انتقال کی خبر آ گئی تھی، لیکن مجھے اتوار کو صبح اس کا علم ہوا، اس کی صحت کے بارے میں مجھے قدرے تردد تھا، میں اپنے رفقاء کے ساتھ جماعت کے مرکز گیا کہ خبر کی تصدیق کر لوں — اگر خدانخواستہ واقعہ صحیح ہے تو اپنے دوستوں سے تعزیت کر دوں، وہاں خبر کی تصدیق اور واقعہ کی کسی قدر تفصیل معلوم ہوئی، چونکہ جماعت کی مجلس شوریٰ بھی انہی دنوں میں منعقد ہوئی تھی، نیز مجلس مشاورت کی وجہ سے بھی بعض اہم ارکان باہر سے آئے ہوئے تھے اس لئے جماعت کے اکثر ذمہ دار اور سرگرم کارکن اس وقت مرکز میں موجود تھے ہم سب نے ایک دوسرے سے تعزیت کی، ہم سب اس حادثہ سے (جس کے اتنی جلد پیش آنے کا کسی کو اندازہ نہ تھا) مغموم و متاثر تھے، اسی روز مجلس مشاورت کی آخری نشست تھی، حادثہ کی اطلاع سب کو مل چکی تھی اور سب اس سے متاثر تھے، صدر مجلس مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے ایک موثر و پر از معلومات تقریر کی جس میں مولانا سے اپنی ذاتی واقفیت کا تذکرہ اور ان کے کمالات کا اعتراف اور اس حادثہ پر گہرے رنج و غم کا اظہار تھا، ان کے بعد قدرے تفصیل کے ساتھ میں نے تعزیتی تقریر کی، جس میں ان کی عظیم شخصیت کے امتیازی پہلوؤں پر روشنی ڈالی، واقعہ کے دوسرے ہی روز لکھنؤ پہونچ کر المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی کے مندوب کو ایک مختصر انٹرویو دیا جو عربی

رسائل و اخبارات میں شائع ہوگا، اب "تعمیر حیات" کو انٹرویو دیتے ہوئے قدرے تفصیل کے ساتھ ان کی ذات و خدمات کے متعلق اپنے خیالات و تاثرات اور اپنے ذاتی تجربات و تعلقات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جدید تعلیم یافتہ نسل پر ذہنی و علمی طور پر مولانا مودودی نے گہرا اور نہایت وسیع اثر ڈالا ہے، انہوں نے اس نسل کی صدہا بے چین روحوں، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے بلکہ اس کا گرویدہ بنانے اور اس کے دل و دماغ میں اسلام کا اعتماد و وقار بحال کرنے کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے جہاں تک اس تعلیم یافتہ اور ذہین (INTELLECTUAL) طبقہ کا تعلق ہے اس اثر انگیزی میں (اس ربع یا نصف صدی میں) مشکل سے کوئی مسلمان مصنف و مفکر ان کا مقابل و ہمسر ملے گا،

مولانا مودودی کے بعض خیالات و تحقیقات . . . .

. . . . . سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو (اور خود یہ ناچیز بھی ان لوگوں میں شامل ہے جنہوں نے اس علمی محاسبہ اور تنقید کا فرض انجام دیا ہے) اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تحریریں اور مضامین مغرب کی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات کے گہرے

مطالعہ اور ذاتی واقفیت پر مبنی ہیں، انہوں نے ایسے مبصرانہ اور جرأت مندانہ انداز میں اس کی تنقید اور اس کے علمی تحلیل و تجزیہ کا فرض انجام دیا ہے جو خود اعتمادی سے بھرپور اور مرعوبیت و سطحیت سے دور ہے، اور جس میں نامور نو مسلم مغربی فاضل علامہ محمد اسد کے سوا ان کا کوئی نظیر و ہمسر اور ان کا کوئی پیش رو (اس قریبی زمانہ میں) نظر نہیں آتا، انہوں نے اسلام کا نظام حیات، اس کی تہذیب کی بنیادیں، حیات انسانی کی تنظیم کے اصول، اسلامی حکومت کے محاسن و خصائص اور اس کے قیام کے طریق و شرائط کو نئے اسلوب اور علمی زبان میں اس خوبی سے پیش کیا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو مغربی طرز استدلال اور جدید علمی اسلوب کا خوگر تھا، اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، انہوں نے اسلام کے حقائق، اس کے قوانین معاشرت اور اس کے اقتصادی، سیاسی نظام کو اس انداز میں پیش کیا جس میں معذرت و تاویل کا وہ رنگ نہیں تھا جو عرصہ سے ان مسائل پر لکھنے والے دانشوروں اور اہل قلم کے یہاں پایا جاتا تھا، بلکہ انہوں نے بارہا مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات کے بارے میں اقدامی پوزیشن اختیار کی اور خود اس کی بنیادوں اور جڑوں پر تیشہ زنی کی، جس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ کے بہت سے افراد کا وہ احساس کمتری اور شکست خوردگی دور ہو گیا جو خالص مغربی تعلیم نے اس میں پیدا کر دی تھی اور بہت سے نوجوانوں کے دل میں اسلام کی سربلندی اور اسلامی حکومت کے قیام کا جذبہ اور اس کی ضرورت کا احساس بیدار ہو گیا جو اس کو ناقابل عمل بلکہ ناقابل تصور سمجھنے لگے تھے اور یہ ان کی وہ خدمت ہے جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، کاش کہ وہ اپنی ساری صلاحیتیں

اور توانائیاں اسی نقطہ پر مرکوز کر دیتے اور جیسا کہ ایک مرتبہ میں نے لاہور کی ایک مخصوص صحبت میں ان سے کہا تھا کہ وہ اس کے لئے فضلاء اور نوجوانوں کی ایک ٹیم تیار کر دیتے جو ان مسائل پر پُرمغز اور فکر انگیز طریقہ پر اور پختہ (AUTHENTIC) لٹریچر پیش کرتی اور اس ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے راستہ میں سد سکندری بن جاتی جو سارے عالم کو اس وقت اپنے لپیٹ میں لے چکا ہے، اور وقت کا اہم ترین چیلنج اور اس عہد کا "فتنۂ ارتداد" ہے، انہوں نے یہ عذر کیا تھا کہ "ہمارے ملک میں محنتی اور ذہین نوجوان نہیں ملتے"

یہ ایک تقدیری بات ہے کہ پاکستان پہونچنے کے بعد ان کی توانائی کا بڑا حصہ جماعت کی تنظیم و توسیع، اسلامی قانون کے نفاذ کے مطالبہ اور دستوری و انتخابی ذرائع سے اقتدار کو جماعت کی طرف منتقل کرنے پر مرکوز ہو گئی، میرا اندازہ ہے کہ ان کو اپنے آخری دور میں اس کا احساس ہو گیا تھا کہ جن پیروؤں اور ہم خیالوں سے وہ اس کی توقعات وابستہ کر رہے ہیں اور جس معاشرہ کی زمین پر وہ یہ عمارت اٹھانا چاہتے ہیں اس میں اس کا بوجھ برداشت کرنے اور اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے اور شاید ان کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ اس ناگزیر درمیانی منزل کے طے کرنے میں کسی قدر عجلت اور خوش گمانی سے کام لیا گیا، اس کو اس سے زیادہ دینی و اخلاقی تربیت اور انہی کے الفاظ میں "سیرت سازی" اور "تعمیر کردار" کی ضرورت تھی جتنی اس کو حاصل ہوئی، اس کے لئے (خواہ اس کا کچھ نام رکھا جائے اور "تصوف" کے مروجہ طریقوں سے کتنا ہی احتراز کیا جائے) کسی قدر روحانی اور باطنی تربیت، ضبط نفس، ایثار و قربانی، ذوق بندگی، اور تعلق مع اللہ کی روح کی ضرورت تھی، اسی

حقیقت کے اشارے ان کے اس مشہور خیال افروز اور ولولہ انگیز مقالے میں ملیں گے جو اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے"؟ کے عنوان سے انہوں نے تقسیم سے بہت پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا تھا، انہوں نے اپنی آنکھوں سے پاکستان کے انقلابات بھی دیکھے خود اپنی جماعت کے انتشار، اس کے بنیادی ارکان کی علیحدگی اور ان کی صف آرائی کے حادثہ سے بھی بارہا دوچار ہوئے، پھر بالکل آخر میں ایران کا "اسلامی انقلاب" کے نام سے وہ انقلاب بھی دیکھا جو قیام حکومت اور معاشرہ اسلامی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے والوں کی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ایک خونی انقلاب اور ایک جذباتی ردعمل بن کر رہ گیا ہے، ان کی خداداد ذہانت اور واقعات سے فائدہ اٹھانے کی فطری صلاحیت سے اس کی پوری امید ہے کہ اگر ان کو مہلت ملتی اور ان کی زندگی اور صحت ساتھ دیتی اور جماعت کی زمام قیادت ان کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ جماعت کے فکر و نظام میں بڑی اہم اور دور رس تبدیلیاں کرتے اور افراد جماعت کی اصلاح و تربیت میں بعض موثر قدم اٹھاتے، اور اسلامی حکومت کے بجائے اسلامی معاشرہ کے قیام پر اپنی توجہ کا بڑا حصہ مرکوز کر دیتے، جولائی ۱۹۷۹ء کے آخری ہفتہ میں جب میری ان سے لاہور میں آخری ملاقات ہوئی اور میں نے ہندوستان میں پیام انسانیت کی تحریک اور پاکستان میں بھی اسی کے مماثل کسی تحریک کی ضرورت کا ذکر کیا اور معاشرہ کی اخلاقی گراوٹ اور زبوں حالی کا تذکرہ کیا تو انہوں نے اس کی تحسین فرمائی اور تائید و ہمت افزائی کے کلمات کہے۔

ان چند "سخن گسترانہ" باتوں کے باوجود جو بہرحال اندازوں اور تمناؤں پر مبنی ہیں اس میں شک نہیں کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے اور اس کے دلوں میں اسلام کی طرف سے اعتماد بحال کرنے میں ان کے قلم نے جو خدمت انجام دی وہ ہر شبہ اور اختلاف سے بالاتر ہے اور عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جدید تحریک اور جد و جہد کی تاریخ میں ناقابل انکار اور ناقابل فراموش ہے۔

مجھے مولانا کی شخصیت اور تحریروں سے واقفیت کی سعادت ۳۵-۱۹۳۴ء ہی میں حاصل ہو گئی تھی جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں میری تدریسی زندگی کا آغاز ہوا، میں نے انکی کتابوں اور تحریروں سے بہت استفادہ کیا اور میری تحریر میں اس کا رنگ آیا، یہ میرا عنفوان شباب تھا[1]، اسی زمانہ میں ان کے شہرۂ آفاق رسالے "ترجمان القرآن" میں میرا ایک مضمون سورۂ کہف کی تفسیر کے بعض اشارات پر شائع ہوا[2] جو مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے بہت پسند کیا، اس وقت مولانا حیدرآباد میں تھے، اور "ترجمان القرآن" وہیں سے نکلتا تھا، میری پہلی ملاقات ان سے لاہور میں اگست ۱۹۳۹ء کی کسی تاریخ میں ہوئی، میں اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ایک دینی مہم اور تلاش کے سلسلہ میں بلوچستان کا سفر کر رہے تھے، اس ملاقات میں مولانا نعمانی اور مولانا حبیب اللہ صاحب (فرزند اکبر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ) بھی ساتھ تھے، مجھے یاد ہے کہ ملتے ہی مولانا نے کہا "آج قران السعدین ہی نہیں قران السعداء ہو گیا"۔

میری مولانا سے خط و کتابت غالباً اگست ۱۹۴۰ء سے شروع ہوئی، میں رفیق محترم مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی کے ساتھ "الندوہ" کا ایڈیٹر تھا ہم لوگوں نے اس میں ایک سلسلہ "میری محسن کتابیں" کے نام سے شروع کیا، جس میں ہندوستان کے مشاہیر اہل علم و اہل فکر کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ افادۂ عام اور تازہ واردان بساط علم کی رہنمائی کے لئے ان کتابوں کا ذکر کریں جنھوں نے ان کے ذہن کی تشکیل اور سیرت کی تعمیر میں خاص حصہ لیا ہے، اور ان کے دماغ پر گہرے اور دیرپا نقش چھوڑے ہیں، میں نے مولانا کو بھی دعوت دی۔ اس سلسلہ میں ان کا جو جواب آیا وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے، کہ ان کے مطالعہ کا نچوڑ اور خود ان کی سوانح و سیرت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، مولانا نے مجھے ۱۰ اگست ۱۹۴۰ء کو ایک مفصل خط لکھا جس میں مجھ سے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "پردہ" کے عربی ترجمہ کا انتظام کرنے کی خواہش ظاہر کی، انہوں نے لکھا کہ،

"میری دلی خواہش ہے کہ عربی میں بھی اس کا ترجمہ ہو جائے، تاکہ ممالک عربیہ خصوصاً مصر میں اس کی اشاعت کی جا سکے، ندوہ کے سوا کسی اور مرکز کی طرف نظر نہیں جاتی، یہ کام اگر ہو سکتا ہے تو وہیں ہو سکتا ہے، براہ کرم آپ کسی ایسے صاحب کو اس کام پر مامور فرمائیں جو جیتی جاگتی زبان میں اُسے منتقل کر سکے"۔

اس کے بعد میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"کچھ مدت ہوئی آپ کا ایک عنایت نامہ آیا تھا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ میں "وہ کتابیں جن کا میں ممنون ہوں" یا "میری محسن کتابیں" کے عنوان پر کچھ لکھوں، میں اس کا جواب دینا بھول گیا، ابھی آپ کو خط لکھتے ہوئے اس کا خیال آیا،

جاہلیت کے زمانہ میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے، قدیم و جدید فلسفہ، سائنس، تاریخ، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اُتار چکا ہوں، مگر جب آنکھیں کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا، علم کی جڑ اب ہاتھ آئی، کانٹ، ہیگل، نٹشے، مارکس، اور دنیا کے دوسرے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بیچاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے ان کو اس کتاب نے ایک دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے، اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے؟ میری اصل محسن بس یہی ایک کتاب ہے، اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے، حیوان سے انسان بنا دیا ہے، تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی، ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ زندگی کے جس معاملہ کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے، گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے، انگریزی میں اس کنجی کو "شاہ کلید" Master Key کہتے ہیں جس سے ہر قفل کھل جائے، سو میرے لئے یہ قرآن شاہ کلید ہے، مسائل حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں وہ کھل جاتا ہے، جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے"۔

خاکسار

ابو الاعلیٰ

مولانا سے میری دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب مولانا اس کمیٹی میں شرکت کے لئے لکھنؤ تشریف لائے جو اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنے کے لئے نواب صاحب چھتاری کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں منعقد ہو رہی تھی، مولانا نے اپنی آمد سے پہلے مجھے اپنی تشریف آوری کی اطلاع دی، اور اپنے قیام کا مجھے ذمہ دار بنایا، اس وقت ان کا ۲۴ دسمبر ۱۹۴۰ء کا ایک خط سامنے ہے جو ایک اہم تاریخی یادگار کے طور پر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور
۲۴ دسمبر ۱۹۴۰ء

مخدومی و مکرمی۔ السلام علیکم

عنایت نامہ ابھی ملا، اور آج ہی اتفاق کی بات ہے نواب صاحب چھتاری کا خط آیا جس میں انہوں نے ایک کمیٹی کی شرکت کے لئے مجھے لکھنؤ آنے کی دعوت دی ہے ..... ان نوابوں اور ان کی کمیٹیوں سے تو مجھے کوئی دلچسپی نہیں اور اگر محض ان کی کمیٹی کی شرکت کا معاملہ ہوتا تو میں ٹال دیتا، مگر اس بہانے ندوہ سے اور آپ کے رفقاء کار سے براہ راست تعلق قائم کرنے کا ایک موقع ہاتھ آتا ہے اس لئے میں نے لکھنؤ حاضر ہونے کا تہیہ کر لیا ہے ..... میں انشاء اللہ ۳ جنوری کو لکھنؤ پہونچوں گا، میرے قیام کے لئے کوئی مناسب انتظام کرنا

آپ کا ذمہ ہے، میں کسی ایسی جگہ ٹھہرنا چاہتا ہوں جہاں ہر قسم کے لوگ مجھ سے مل سکیں، اور آزادی کے ساتھ گفتگو کر سکیں، علی گڑھ میں میں نے اولڈ بوائز لاج کو پسند کیا تھا، اس کا یہ فائدہ ہوا کہ ہر خیال اور ہر گروہ کے آدمی مجھ سے بے تکلف ملے، ایسی ہی کوئی جگہ میں لکھنؤ میں چاہتا ہوں، میں چونکہ بے ہمہ ہوں اس لئے خدا نے مجھے باہمہ بھی بنا دیا ہے، سخت قسم کے دہریہ اور کمیونسٹ بھی مجھ سے اسی طرح ملتے ہیں جس طرح مومنین صادقین، اور ان لوگوں سے بات چیت کرنے میں ایسی جگہ آسانی ہوتی ہے جہاں وہ شخصیتیں نہ ہوں جن سے یہ لوگ تکلف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں،

رسالہ[1] کے متعلق میں انشاء اللہ وہیں بالمشافہہ گفتگو ہوگی۔

خاکسار

ابو الاعلیٰ

مولانا جنوری ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتہ میں لکھنؤ تشریف لائے، یہ زمانہ مسلمانوں میں ایک طرف کانگریس کی تحریک (جس کی قیادت جواہر لال نہرو کر رہے تھے) کے زور، دوسری طرف پاکستان کا نعرہ بلند ہو جانے کی وجہ سے بڑی بے چینی اور جوش و سرگرمی کا تھا، مولانا کے پرزور، فکر انگیز مضامین اور "ترجمان القرآن" کے مقالات نے اسلامی حلقوں میں ایک جنبش اور حرکت پیدا کر دی تھی، نوجوان اسلام کی اس ترجمانی کے دلدادہ تھے جو بلند سطح سے اور پُر اعتماد لہجہ میں کی جائے اور مسلمانوں میں امنگ، حوصلہ، اور اپنے ماضی اور تہذیب پر اعتماد پیدا کرے، مولانا کا قیام دار العلوم کے مہمان خانہ میں ہوا، جہاں استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا آزاد سبحانی مقیم تھے، یونیورسٹی کے مسلمان طلباء اور شہر کے صاحب فکر مسلم نوجوان جوق جوق آتے اور مولانا سے بڑے ذوق و عقیدت سے ملتے ایسے موقعہ پر مولانا ان کو لے کر مسجد میں جا بیٹھتے، میں ندوہ کی طرف سے ان حضرات کی میزبانی اور رفاقت پر مامور تھا، اور مولانا لکھنؤ کے احباب میں مجھی سے زیادہ مانوس اور واقف تھے، اس لئے مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا اور زیادہ سے زیادہ رہنے کا موقع ملا، میں مولانا کی سنجیدگی، .... نستعلیق، اسی کے ساتھ طبیعت کی شگفتگی، اخلاق، اور اپنے مقصد کی لگن سے بہت متاثر ہوا، مولانا چند دن قیام کر کے واپس گئے، لیکن خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، اگلے سال ۱۹۴۱ء میں غالباً جماعت کی خواہش پر جو لکھنؤ میں قائم ہو چکی تھی اور جس کا میں ذمہ دار تھا، وہ دوبارہ تشریف لائے، آنے سے پہلے حسب معمول انہوں نے مجھے خط لکھا، میں نے غالباً ان سے لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھنے کے لئے ایک مقالہ تیار کرنے کی فرمائش کی تھی، ان کا یہ خط جو ۲۹ ستمبر ۱۹۴۱ء کا لکھا ہوا ہے اسی کے جواب میں ہے،

مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور
۲۹ ستمبر ۱۹۴۱ء

مخدومی و مکرمی۔ السلام علیکم

"آپ کے پہلے عنایت نامہ کا جواب پہلے دے چکا ہوں، بعد میں کارڈ ملا، خطبہ کے لئے "نیا نظام عالم"، کوئی نیا موضوع نہیں، نہایت پامال چیز ہے، اور آج کل کچھ فیشن ہو گیا ہے کہ ہر ایک اس پر کچھ نہ کچھ بولے اس بنا پر نہ میرے خطبہ کی کوئی خصوصیت ہوگی اور نہ اس کی طرف کوئی توجہ کرے گا، اس کے بجائے خطبہ کا یہ عنوان بہتر ہے "نوع انسانی کا معاشی (یا اقتصادی) مسئلہ اور اس کا اسلامی حل"، آپ یونیورسٹی کے سکریٹری صاحب کو اطلاع دے دیجئے۔"

خاکسار

ابو الاعلیٰ

مولانا لکھنؤ تشریف لائے اور نوجوانوں نے پروانہ وار ہجوم کیا، انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی یونین میں عنوان بالا کے ماتحت اپنا فاضلانہ خطبہ پڑھا، جو ان کے مضامین میں شائع ہو گیا ہے، اسی کے ساتھ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے لئے ایک مقالہ "نیا تعلیمی نظام" کے عنوان سے میری فرمائش پر لکھ کر لائے تھے جو طلبہ کی انجمن "الاصلاح" میں پڑھا گیا۔

میرا رابطہ مولانا سے اور جماعت سے برابر قائم رہا، میں نے جماعت کی اس مجلس عاملہ کے جلسہ میں شرکت کی جو فروری ۱۹۴۲ء کو لاہور میں منعقد ہوا تھا، اور جس میں مولانا کی تحریروں اور بعض خیالات کی اس مخالفت کی بنا پر جو ہندوستان کے بعض مشاہیر فضلاء اور اہل قلم نے شروع کر رکھی تھی، یہ مسئلہ در پیش تھا کہ مولانا فی الحال جماعت کی امارت سے سبکدوشی اختیار کر لیں، اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کو امیر منتخب کیا جائے۔ جماعت کی زندگی اور تاریخ میں یہ مرحلہ بہت اہم تھا، میرا ووٹ اس میں مولانا کے حق میں تھا اور اس کی بنیاد یہ تھی کہ یہ ایک مصنوعی رد و بدل ہوگا جس سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہ ہوگا، جماعت کا وجود مولانا کی تحریروں کے اثر سے عمل میں آیا ہے، اور اس کی وابستگی اور انتساب بدستور انہیں کی طرف رہے گا، اسی پر فیصلہ ہوا اور جماعت کا نظام وہی رہا، جماعت کی دوسری مجلس انتظامی میں میری شرکت اکتوبر ۱۹۴۲ء میں دہلی میں ہوئی، اس موقعہ پر میں مولانا کے ساتھ علی گڑھ بھی گیا، اور ایک دو دن اولڈ بوائز لاج میں ہم دونوں کا قیام رہا، میں نے یونیورسٹی کے حلقہ میں مولانا کی مقبولیت کا اندازہ کیا۔

اس زمانہ میں مولانا کو عربی میں ایک ایسے رسالہ کے اجراء کا بڑا تقاضا تھا جو دعوت و جماعت کا ترجمان بن سکے، میں نے اس سلسلہ کی مشکلات کا ذکر کیا اور اس پر اتفاق ہوا کہ فی الحال عربی میں مضامین کے ترجمہ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے، اور ان کو عالم عربی کے موقر مجلات و رسائل میں بھیجا جائے، مولانا یہ خدمت میرے سپرد کرنا چاہتے تھے میں نے اس کے لئے رفیق محترم مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کا نام تجویز کیا جو مولانا نے منظور کیا، اور اس کے نتیجہ میں پہلے مشرقی پاکستان میں پھر مغربی پاکستان میں "دار العروبہ" کے نام سے ادارہ قائم ہوا، اور مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم نے اس سلسلہ کو اس قابلیت و خوبی سے انجام دیا کہ عالم عربی میں مولانا کا اور ان کی دعوت و تحریک کا ایسا تعارف ہوا کہ اگر مولانا کا خود بھی عربی میں لکھنے کا معمول اور تجربہ ہوتا تو اس سے زیادہ ممکن نہ تھا، عالم عربی میں مولانا کی مقبولیت اور تعارف کا یہ کتابیں سنگ بنیاد ثابت ہوئیں اور انہوں نے اس کے لئے راہ ہموار کر دی، جس سے بعد میں پورا فائدہ اٹھایا گیا، جماعت و تحریک کی تاریخ میں مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں صوبہ سرحد و پنجاب کے ایک سفر کے دوران مجھے دار الاسلام پٹھان کوٹ (جہاں مولانا مستقل طور پر مقیم تھے اور جس کو تحریک کا مرکز بنانا تجویز ہوا تھا) جانے کا اتفاق ہوا، اور کچھ دن ان کا مہمان بننے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد عرصہ تک ذاتی ملاقات کی نوبت نہیں آئی، ۱۹۵۱ء میں جب تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان جانا ہوا تو لاہور کے قیام کے دوران مولانا سے لاہور سینٹرل جیل میں ملاقات ہوئی، اس ملاقات میں ملک نصر اللہ خاں عزیز میرے رفیق و رہبر تھے، مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم کا قریبی زمانہ میں انتقال ہوا تھا، ہم دونوں نے ایک دوسرے سے تعزیت کی۔

اس کے بعد جون ۱۹۵۶ء میں ان سے ملنا ہوا جب وہ ہمارے دوست ڈاکٹر سعید رمضان کی دعوت پر ان کی منعقد کی ہوئی موتمر اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لئے دمشق آئے، میں ایک دو مہینے پہلے سے دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر وہاں گیا ہوا تھا، اس موقعہ پر پاکستان سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم اور مولانا ظفر احمد صاحب انصاری بھی آئے ہوئے تھے کانفرنس میں ڈاکٹر محمد ناصر سابق وزیر اعظم انڈونیشیا کو صدر اور مولانا کو اور مجھے نائب صدر منتخب کیا گیا تھا، اس کانفرنس کا سلسلہ کئی روز جاری رہا اور دو مرتبہ مجھے مولانا کی خواہش اور اصرار پر ان کی تقریر کا عربی میں ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا، اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں جب مدینہ طیبہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا اور ہم دونوں اس کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے تو سلسلے کئی روز مولانا سے ملنے اور اس کمیٹی میں شرکت کرنے کا سلسلہ جاری رہا، اسی سال حج کے موقعہ پر رابطہ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور ہم دونوں اس کی مجلس تاسیسی کے رکن منتخب ہوئے، اس سلسلہ سے کئی مرتبہ اس کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر مولانا سے ملنے اور رابطہ کے جلسوں

میں قریب بیٹھنے کا موقع ملا، یہاں تک کہ گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے مولانا کے سفر کا سلسلہ ختم ہوگیا، غالباً آخری اجلاس جس میں ہم دونوں نے شرکت کی ۶۲ء کا اجلاس تھا۔

آخری ملاقات جولائی ۱۹۷۸ء کی کسی تاریخ کو لاہور میں مولانا کے دولت خانہ پر ہوئی، مولانا بڑے اخلاق اور تپاک سے ملے، پاکستان کے موجودہ حالات پر تبصرہ ہوا، میں کراچی میں رابطہ کی طرف سے ہونے والی پہلی اسلامی ایشیائی کانفرنس میں شرکت اور پاکستان کا ایک مختصر دورہ کرکے لاہور پہنچا تھا ہم دونوں اس پر متفق تھے کہ موجودہ انقلاب ایک خوش آئند اور مبارک انقلاب ہے، مولانا نے فرمایا کہ یہ بات واضح ہے کہ ضیاء الحق صاحب کی مدد کرنی چاہیئے اور ان کو ناکام نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔

۴۳ء میں میرا ضابطہ سے جماعت سے تعلق نہیں رہا تھا لیکن مولانا سے اور جملہ رفقاء جماعت سے دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات تھے اور ایک دوسرے کا احترام اور اعتراف میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، مارچ ۴۷ء میں جب میں دارالاسلام میں ان کا مہمان ہوا تو وہ میری اس ذہنی تبدیلی اور جماعت کے فکر سے میری بے اطمینانی سے واقف ہو چکے تھے لیکن اس کا تعلقات اور باہمی ربط وضبط پر کوئی اثر نہ تھا، عربی دعوتی لٹریچر کے بارے میں تبادلۂ خیال بھی ہوا، اور مولانا نے میرا ایک عربی مضمون جو "دعوتان متنافستان" (دو حریف اور مدمقابل دعوتیں) کے عنوان سے تھا، ملاحظہ فرمایا اور پسند کیا، وہ مع تمام رفقاء کے اسٹیشن مجھے رخصت کرنے کے لئے تشریف لائے،

میرے مولانا کی تحریروں اور جماعت کے لٹریچر سے تاثر اور وابستگی کی بنیاد مولانا کے وہ فاضلانہ تنقیدی مضامین تھے جو انہوں نے مغربی تہذیب اور اس کے فلسفۂ حیات اور موجودہ مادی نقطۂ نظر کے خلاف لکھے تھے اور جن کا بڑا حصہ ان کے مجموعۂ مضامین "تنقیحات"[1] میں شامل ہے، یہاں میرے اور مولانا کے خیالات میں وہی توارد تھا جو ایک

چھوٹے اور بڑے، نومشق و کہنہ مشق مصنفوں کے درمیان ہو سکتا ہے، دین کی اس جدید تفہیم و تشریح سے نہ مجھے کچھ زیادہ دلچسپی تھی نہ ضرورت جو مولانا کی دوسری کتابوں مثلاً "قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں" "تفہیمات" اور "رسائل و مسائل" میں پائی جاتی ہے، اس لئے کہ اس بارے میں میرا معاملہ کسی ایسے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان سے بالکل مختلف تھا جو دین کا تصور اور اس کا فہم اس کے اصل سرچشموں (کتاب و سنت اور دینی ماحول و تربیت) کے بجائے کلیۃً مولانا یا کسی دوسرے مسلمان مفکر و مصنف کی کتابوں سے حاصل کرتا ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ جماعت کے اس علمی اور تنقیدی حصے کو جو مغربی تہذیب اور موجودہ مادی فلسفوں اور نظامہائے حیات سے متعلق تھا، دین کی اس تفہیم و تشریح سے الگ نہیں کیا جا سکتا جو خود مولانا اور جماعت کے قائدین کی نظر میں بنیاد اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے، میرا شعور جس قدر پختہ اور میرا مطالعہ اور تجربہ جتنا وسیع ہوتا گیا میری ذہنی کشمکش میں اضافہ ہوتا گیا، اس کا نقطۂ ارتقاء وہ تھا جب میری ہندوستان کی مشہور تبلیغی تحریک کے داعی و بانی مولانا محمد الیاس صاحب رح کی خدمت میں آمد و رفت زیادہ ہوئی، میں جب انکی زندگی، ان کی باطنی کیفیات اور ان کی ایمان و احتساب کی دعوت سے گہرے طور سے متاثر ہوا تو یہ ذہنی خلیج عمیق اور وسیع ہونے لگی۔

میں نے ایک بار لکھنؤ سے جب مولانا مودودی کو اپنی اس ذہنی کشمکش کا حال لکھا اور ان کو مولانا محمد الیاس صاحب رح سے میرے گہرے تاثر اور تبلیغی کام میں روزافزوں انہماک کا حال بطور خود بھی معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے اس بارے میں یکسو ہو جانے کی اجازت بلکہ مشورہ دیا،

میں نے جماعت سے اپنی بے اطمینانی اور اس کے اسباب کا اظہار کرنے میں ہمیشہ احتیاط سے کام لیا ہے اور جماعت کے موافقین یا مخالفین نے جب خط و کتابت کے ذریعہ مجھ سے میری علیحدگی کے اسباب اور مولانا یا جماعت کے بارے میں میری رائے دریافت کی تو میں نے اس کا ایسا جواب دینے سے ہمیشہ احتراز کیا جس

کو اشاعت میں لاکر غلط مقاصد حاصل کئے جا سکتے تھے، بے اطمینانی کے اسباب ریاضی و اقلیدس کے قواعد کی طرح چند بندھے ٹکے لفظوں اور ضابطوں کی شکل میں بیان نہیں کئے جا سکتے، اس کے اسباب مختلف النوع ہو سکتے ہیں، ان کا تعلق تعلیم و تربیت، ماحول کے اختلاف، وہ شخصیتیں جن سے آدمی متاثر ہوتا ہے، ان کی رنگارنگی، ذاتی تجربات، موروثی و خاندانی اثرات، ذہنی ارتقاء اور مطالعہ کے نتائج سے بھی ہو سکتا ہے اور ان سب کا الفاظ کی گرفت میں (خاص طور پر مختصر خطوط کی شکل میں) آنا مشکل ہوتا ہے، میں عام طور پر اس کے جواب میں لکھ دیتا تھا کہ اس کے سمجھنے کے لئے آپ میری کتاب "ارکان اربعہ"، "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین"، "تاریخ دعوت و عزیمت" اور عربی میں "ربانیۃ لا رہبانیۃ"[2] کا مطالعہ کیجئے۔

یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا، جب تک کہ میں دیانت کے ساتھ اس نتیجہ پر نہیں پہونچ گیا کہ اب مجھے مولانا کے دین کی اس تفہیم و تشریح کے متعلق کچھ لکھنا چاہیئے۔ جس کی بنیاد ان کی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" ہے، اور جو اقلیدس کے اصول موضوعہ کی طرح ان کی فکر و دعوت میں جاری و ساری ہے، اور میں نے اس تفہیم و تشریح کا اثر برصغیر اور ممالک عربیہ کے ان نوجوانوں کی فکر و تحریر میں نمایاں طریقہ پر دیکھا جنہوں نے دین کو مولانا اور ان کے نامور عرب خوشہ چیں اور میرے عزیز و محبوب دوست سید قطب شہید رح کی دینی ترجمانی اور تفہیم سے اخذ کیا تھا اور انہوں نے دینی حقائق و مقاصد کو انہی کے ذریعہ سمجھا تھا، میں نے سب سے پہلے اپنی عربی کتاب "النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن" کے تیسرے اور اسکے اردو ترجمہ "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" کے دوسرے ایڈیشن میں اس پر مختصراً ایک نوٹ لکھا، پھر بڑے فکر و تأمل اور دعا و استخارہ کے بعد ایک دینی فریضہ سمجھتے ہوئے رمضان ۱۳۹۸ھ (اگست ۱۹۷۸ء) میں اس موضوع پر مستقلاً قلم اٹھایا، اور ایک شاہد عینی اور مستفید کی حیثیت سے اسکو ضروری سمجھا کہ مولانا کی خدمات اور ان کی تصنیفی

انفرادیت کا پورا پورا اعتراف کرتے ہوئے اپنے خدشات اور اندیشوں کو ظاہر کیا جائے کہ جماعت میں شریک ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد بلاشبہ دین کی طالب اور خدمت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی حریص و خواہشمند ہے اور اس کو جب کتاب و سنت کی روشنی میں مخلصانہ مشورہ دیا جائے گا تو اس سے وہ ضرور فائدہ اٹھائے گی، اس لئے کہ اس کے دستور نے یہ کہہ کر کہ "رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے اور کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو" نیز مولانا کے لٹریچر نے جو اسی اصول پر مبنی ہے اس کے ذہن کی وہ تربیت کی ہے جو عصر حاضر میں کم جماعتوں کی کی گئی ہوگی، میں نے کتاب کے مسودہ کو بار بار اس خیال سے پڑھا کہ اس میں کوئی طنزیہ جملہ یا تیز لفظ ایسا نہ ہو جو اس مقصد کے لئے مضر ہو، اور جہاں تک ہو سکا اس کا اہتمام کیا۔

میرا ارادہ تھا کہ کتاب کے چھپنے کے بعد اس کا پہلا نسخہ اپنے خط کے ساتھ مولانا کی خدمت میں بھیجوں، میں نے یہ خط احمد نگر سے ۳۰ اکتوبر ۷۸ء کو لکھا، لیکن جن صاحب کے ساتھ اس کتاب اور خط کو بھیجنا تھا ان کا سفر ملتوی ہوگیا، اور کتاب قدرے تاخیر سے ان کو ملی، اس کتاب پر مولانا کا ردعمل اس ردعمل سے بہت مختلف تھا جو ہندوستان میں جماعت کے حلقہ کے عام ہمدردوں اور متفقین میں دیکھا گیا، میری کتاب غالباً مولانا کو وسط جنوری (۱۹۷۹ء) میں ملی، انہوں نے ۲۳ جنوری کو اس کی رسید دیتے ہوئے حسب ذیل گرامی نامہ تحریر کیا۔

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ،
لاہور، پاکستان

مخدومی و مکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

عنایت نامہ مورخہ ۵ صفر ۹۹ھ ملا، اور اس کے ساتھ آپ کی تازہ کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" کا ایک نسخہ بھی موصول ہوا، میں آپ کا شکرگذار ہوں کہ میری جن چیزوں کو آپ نے خدشات کا موجب سمجھا اس پر تنقید فرمائی، مزید میری جن جن چیزوں کو آپ دین اور اہل دین کے لئے مضرت رساں

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

[1] مشہور مجموعۂ مضامین "الی الاسلام من جدید" اس سے مراد اسلام اور مغربی تہذیب اور مادی فلسفۂ حیات ہے۔ [2] اب اسکا اردو ترجمہ "تزکیہ و احسان" یا "تصوف و سلوک" کے نام سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔

غیر مذہبی، عربی تعلیم

(از علامہ سید سلیمان ندوی رح)

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں عربی مدرسے ہر صوبہ کے ممتاز شہروں میں کثرت سے موجود ہیں، اور ان مدرسوں میں عربی طالب علموں کی تعداد بھی تھوڑی نہیں اور خدا کا سب سے بڑا شکر یہ ہے کہ یہ مدرسے زیادہ تر مسلمانوں ہی کی فیاضی اور امداد سے چل رہے ہیں، اسی لئے ہم کو اس پر غور کرنا ہے کہ ہماری یہ محنت اور یہ دولت بیکار تو ضائع نہیں جا رہی ہے؟

اس مسئلہ کو سوچنے کے لئے ہم کو پہلے یہ دیکھنا ہے کہ ان عربی مدرسوں کے بانیوں کی غرض کیا ہے؟ بات صفائی سے کہنی ہے اس لئے دوستوں کی آزردگی کا خیال دل سے نکال دینا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان میں اسلامی طاقت کا زوال ہوا اور ہر طرف سے عیسائی مشنریوں نے مسلمانوں پر حملے کئے اس وقت علماء میں جو شیر مرد آگے بڑھے اور جنہوں نے اپنے علم اور زبان اور قلم سے اس فتنہ کا مقابلہ کیا انہیں میں سے چند اہل دل اور عاقبت بیں ہستیاں ایسی تھیں جنکی دور رس نگاہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر ملک میں اسلامی علوم و فنون کے قلعے نہ بنائے گئے تو حملہ آور ہمارے مورچوں کو ایک دن فتح کرلیں گے، اس خیال کے آتے ہی انہوں نے خدا پر بھروسہ کرکے عربی مدرسوں کی بنیاد ڈالی ۱۲۸۳ھ میں مفتی عنایت احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ فیض عام کانپور بنایا جس سے ندوہ کا وجود ہوا اور اسی زمانہ میں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح اور ان کے دوسرے نیک نیت رفیقوں نے مل کر مدرسہ اسلامیہ دیوبند کی بنیاد ڈالی۔

یہ دیکھ کر انگریزوں نے ایک اور فتنہ کھڑا کیا جس کی تشریح یہ ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کو یہ یقین تھا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے برخلاف جو یہ عظیم الشان طاقت اٹھ کھڑی ہوئی تھی وہ دراصل علماء کی تحریک کا نتیجہ تھی، اس کے لئے انہوں نے یہ چال اختیار کی کہ عربی تعلیم کے لئے کالج اور مدرسے بنائے جائیں جن کی زبان عربی ہو مگر اس میں اسلامی روح نہ ہو، تاکہ اس روح سے خالی ہوکر عربی تعلیم کی ایسی لاشیں تیار ہوں جن میں حسن و جمال تو پورا ہو مگر زندگی کی طاقت نہ ہو، دلی کالج، لاہور، الہ آباد اور کلکتہ کے مشرقی صیغے اس خیال کے بہترین مظہر ہیں۔ ہمارے علی گڑھ کالج میں ۱۹۰۵ء میں یورپین ارمان عربی پروفیسر کی منظوری کا بھی یہی منشاء تھا کہ عربی تعلیم مذہبی روح کے بغیر پڑھائی جائے حالانکہ بے دین کی عربی تعلیم کا درجہ اس عربیت جاہلیت سے کم نہیں جس کے مٹانے کے لئے اسلام آیا۔

ہم کو امرؤالقیس، طرفہ، نابغہ، اعشیٰ، حاتم طائی، عمرو بن کلثوم وغیرہ جاہلیت کے شعراء سے فی نفسہ کوئی دلچسپی اس سے زیادہ نہیں جتنی دنیا کی دوسری زبانوں کے ادبیات سے ہم کو ہو سکتی ہے لیکن اس کے باوجود اگر شعراء جاہلین کے کلام اور اشعار سے ہم کو دلچسپی ہے تو صرف اس لئے کہ یہ قرآن پاک کے سمجھنے اور سمجھانے میں ہم کو کچھ مدد دیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا ہے، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیوان العرب کہہ کر ہم کو سمجھایا ہے۔

اگر یہ نہ ہو تو سچ یہ ہے کہ بیروت کے عیسائی ادیبوں اور نحویوں نے عربی زبان اور ادب کی جو خدمت کی ہے بلکہ یورپ کے بعض عربی کے عالموں نے عربی دواوین و لغات کی تصحیح اور اشاعت میں جو زحمت اٹھائی ہے وہ آج کل کے بہت سے مسلمانوں کی خدمت سے زیادہ ہے۔

منشاء یہ ہے کہ عربی تعلیم صرف عربی تعلیم کے لئے نہ ہماری قومی زندگی کا مقصد ہو سکتا ہے نہ ہماری مذہبی زندگی کا تقاضا ہے نہ اُس کے لئے ہماری محنت اور دولت کا صرف کچھ سودمند ہے بلکہ جو بات ہے وہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کا مدار جس صحیفہ الٰہی پر اور ہمارے رسول کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کی تعلیم و سیرت اور آپ کی اور آپ کے رفقاء کرام رضی اللہ عنہم کے ارشادات گرامی جس زبان کے خزانہ میں محفوظ ہیں وہ ہی مقدس زبان ہے اس لئے اس زبان کے جانے اور اس میں مہارت پیدا کئے بغیر ہم خدا اور اسکے رسول کے صحیح منشاء سے واقف نہیں ہو سکتے اور نہ اس کے فیض سے سیراب ہو سکتے ہیں جو اس زبان کے سرچشمے سے بہہ رہا ہے۔ اس لئے اس زبان کو جاننا، اس میں ہر طرح مہارت پیدا کرنا اور اس کے الفاظ کی تحقیق، محاوروں کی تفتیش اور طرز و اسلوب کلام کی واقفیت فرض کفایہ کی حیثیت سے مسلمانوں پر واجب ہے اور اسی لئے ملک کے مختلف گوشوں میں عربی مدرسوں کا قیام ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں انقلاب حکومت کے بعد سے جو مذہبی فتنے پیدا ہوئے وہ اسی غیر مذہبی عربی تعلیم کا نتیجہ ہے، سرسید، مولوی چراغ علی اور ان کے رفقاء کی تحریک، قادیان کا ہنگامہ، اہل قرآن کا فتنہ، مشرقی صاحب کی تحقیق، ان سب کا سرچشمہ وہ عربی تعلیم یا عربی زبان کی واقفیت ہے جس میں مذہبی تعلیم و تربیت کا عنصر شامل نہ تھا۔

بات یہ ہے کہ عربی زبان کی تھوڑی سی واقفیت جس میں مذہبی تعلیم کی تاثیر نہ ہو ان کو یہ باور کراتی ہے کہ جب ہم عربی زبان جانتے ہیں تو قرآن پاک اور حدیث کی تفسیر و تشریح کا بھی ہم کو پورا حق ہے اور یہی خیال ہر قسم کی اجتہادی غلطیوں کا دروازہ کھولتا ہے۔

اس موقع پر قرآن پاک اور حدیث کی دو اجتہادی غلطیوں کی مثال یاد آئی، ایک ڈپٹی صاحب جو قرآنی اجتہاد کے مدعی اور حدیث کے منکر تھے ایک دفعہ ملنے آئے، اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ قرآن تو ایک ایسی آسان اور سہل کتاب ہے کہ ہر شخص جو تھوڑی بہت عربی جانتا ہو وہ ان کا مطلب بہت آسانی سے بیان کر سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن پاک کی کس آیت سے آپ نے ہر کس وناکس کا یہ حق تفسیر قیاس کیا ہے، فرمانے لگے کہ قرآن پاک کی اس آیت سے ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر اور اس کا ترجمہ یوں کیا (اور ہم نے قرآن کو سمجھنا آسان کیا تو ہے کوئی سمجھنے والا) میں نے پوچھا کہ سمجھنا اور سمجھنے والا کس کا ترجمہ ہے ارشاد ہوا "ذکر" اور "مدکر" کا۔ میں نے دریافت کیا کہ مدکر کا مادہ کیا ہے؟ بڑی صفائی سے ارشاد ہوا ادراک (سمجھنا اور دریافت کرنا) میں نے سر پیٹ لیا کہ اس عربی دانی پر قرآن پاک کی تشریح کا حق مانگا جاتا ہے۔

مصر کے مشہور عیسائی ادیب و مورخ جرجی زیدان نے اپنی کتاب التمدن الاسلامی میں کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے پر ایک باب لکھا ہے اور مولانا شبلی مرحوم کے دلائل کو رد کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے حکم سے مسلمانوں نے ہی اس کو جلایا تھا۔ اس دعوے کے ثبوت میں جہاں اور دلیلیں دی ہیں۔ ایک دلیل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ السلام نے فرمایا ہے ان الاسلام یھدم ما قبلہ یعنی اسلام اپنے پہلے کی چیز کو منہدم کر دیتا ہے تو پیغمبر اسلام کے اس حکم کے بموجب ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اسلام سے پہلے کی عمارتوں کو ڈھا دے حالانکہ جس شخص کی نظر میں پوری حدیث ہے وہ اس عربی داں عیسائی ادیب کی

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

اسلام کے قلعے

از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

جدید اجتماعی و سیاسی تغیرات نے بہت سے قومی و مذہبی مسائل کو موضوع بحث بنا دیا ہے، اور زندگی کے بہت سے شعبوں اور اداروں کی ضرورت اور افادہ پر بحث و تنقید کا دروازہ کھل گیا ہے۔ مسلمانوں کے بعض حلقوں میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ عربی مدارس کی اس انقلابی زمانہ میں کیا ضرورت ہے اور ان کے نہ ہونے سے ہماری زندگی کا کون سا خانہ خالی رہتا ہے، آج کی صحبت میں ہم اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

اس سلسلہ میں چند بنیادی حقائق کا سمجھ لینا ضروری ہے جو اس مسئلہ میں مبادی کا کام دیں گے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ مسلمان قوم کا مزاج اور قوام دنیا کی تمام قوموں سے مختلف ہے، مذہب امت مسلمہ کے خمیر اور ترکیب میں داخل ہے۔ یہ قوم کسی جگہ اور کسی وقت بھی غیر مذہبی نہیں ہو سکتی، بلکہ مذہب اور ایک متعین مذہب (اسلام) کے بغیر اس کا تصور ہی ممکن نہیں، مذہب اس کے فکر و عمل کا مرکز، اس کے کاموں کی صحت و غلطی اور اس کی ترقی و تنزل کی میزان اور اس کی صحت طبعی اور انحراف مزاج کا متیاس ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس امت کی بنیاد ایک خاص قانون (شریعت) اور ایک خاص دستور (قرآن و حدیث) پر ہے یہ قانون مکمل اور یہ دستور منضبط ہے، اس امت کو دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی زندگی اور فکر کا سرچشمہ تغیر پذیر، انسانی اجتہادات و تجربات اور غیر قطعی نظریات کے بجائے وحی الٰہی ہے، دنیا کی دوسری تہذیبوں کے برخلاف اس کی تہذیب و تمدن کی بنیاد، دیواروں اور ستونوں، میناروں اور گنبدوں، کاغذ کے شیرازوں، تصویروں کے نقوش اور موسیقی کے آلات پر نہیں ہے، بلکہ چند ابدی حقائق، چند اصول و نظریات، اور اس مخصوص اخلاقی فلسفہ پر ہے جو وحی سے ماخوذ اور اسی کا پیدا کیا ہوا ہے، دنیا کی دوسری "خود رو اور خود ساختہ" قوموں کے برخلاف اس کے مستقبل کی بنیاد اس کے ماضی پر ہے اس کے سامنے زندگی کا ایک بلند ترین معیار اور ترقی کا آخری نمونہ ہے اور یہ نمونہ گذر چکا ہے لیکن تاریخی و تحریری طور پر محفوظ ہے، یہ سنت رسولؐ، اسوۂ صحابہؓ اور خلافت راشدہ کا عہد ہے، "سنت" اور "سلف" کی جو اہمیت اسلامی تعلیمات میں ہے غالباً کسی دوسرے مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔

یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ دین کا مفہوم جتنا اسلام میں وسیع اور ہمہ گیر ہے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو اسلام کے صحیح نقطۂ نظر اور تعلیمات نبویؐ کے مطابق سچے مسلمان کی پوری زندگی دین ہے اور نیت کے تغیر سے اس کا ہر کام عبادت ہے اس لئے اس میں دین و دنیا کی وہ تقسیم نہیں ہے جو کسی مذہب میں ہے، نہ دین و دنیا کے شعبے اور ان کے اشخاص اس طرح علیحدہ علیحدہ اور ان کے حدود ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں جس طرح عیسائیوں میں، مذہب مسلمان کی زندگی میں جلد موثر ہوتا ہے اور جلد متاثر، اگر اسکی زندگی کے مسائل نہایت ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ دین کی روشنی میں اور اسکی مصالحت اور سمجھوتے سے طے نہ کئے جائیں تو نہایت آسانی سے وہ دین سے ٹکرا جاتے ہیں اور مسلمان کی زندگی اور اس کے مذہب پر اُن کا اثر پڑتا ہے، مثال کے طور پر صلح و جنگ کے قوانین تعزیرات، لین دین کے معاملات، اور کتنے اجتماعی و معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن کا مذہب سے گہرا تعلق اور اسلامی قانون سے ارتباط ہے، ان مسائل کو طے کرنے کے لئے کتنی دینی بصیرت اور کس قدر علم کی ضرورت ہے۔

جس قوم کا مزاج اتنا نازک اور پیچیدہ ہو اور جس کے مذہب و قانون کا دائرہ اتنا وسیع ہو اس کے علاج و طبی مشورہ کے لئے کیسے مزاج داں و نباض اور کیسے حاذق کی ضرورت ہے۔

جو طبقہ یا جماعت مسلمانوں کی رہنمائی کے منصب کی امیدوار ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے قانون اور دستور سے واقف ہو اس سرچشمہ سے سیراب ہو جس سے اسکی زندگی کی نہریں پھوٹی ہیں، اور اسکی رگوں میں اس کا آب حیات جاری ہے ان ابدی حقائق کا علم اور اُن اصول و نظریات پر ایمان رکھتا ہو اور اس اخلاقی فلسفہ کا قائل اور عامل ہو جس پر اس کے تمدن و تہذیب کی بنیاد ہے، اس کے ماضی سے باخبر اور اس بلند معیار اور نمونہ سے متاثر ہو جس پر امت کے حال و مستقبل کی تعمیر ہونی چاہئے۔

اس سلسلہ میں ایک اور حقیقت سمجھ لینی چاہئے، اسلام دراصل نام ہے اس مستقل، واضح اور متعین دینی اخلاقی اور اجتماعی نظام کا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں لے کر آئے، اسی کا نام شریعت محمدیؐ ہے، اس میں عقائد بھی ہیں، اعمال بھی، اخلاق و معاملات بھی، باقی جو کچھ ہے یا اس کے لئے وسیلہ ہے یا اُس کا نتیجہ، امت کا سب سے بڑا فریضہ اس نظام کی حفاظت ہے، عقائد کی حفاظت بھی ضروری ہے اور احکام کی حفاظت بھی، ضرورت ہے کہ عقائد ان تمام تحریفات سے محفوظ رہیں جو دوسرے مذاہب میں پیش آئیں اور جن کا اس امت میں بھی ہر وقت خطرہ ہے، ضرورت ہے کہ نبوت محمدیؐ نے ذات و صفات باری تعالیٰ، توحید و رسالت، قضا و قدر، حشر و نشر، امور غیب اور وحی کے متعلق جو تشریح کی ہے اور ان کے جو حدود قائم کئے ہیں، وہ باقی رہیں اس لئے کہ ان تمام مسائل کی بنیاد قیاس و تخمین پر نہیں، بلکہ وحی و نبوت پر ہے اور نبوت محمدی نے تکمیل کر دی ہے۔

احکام پر عمل اسی طرح ہو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ہوا، شرعی احکام و عبادات میں ترمیم و اضافہ (بدعات) سے محفوظ رکھا جائے، پرانے آسمانی مذاہب ان بدعات کی وجہ سے اس طرح مسخ ہوئے کہ اب ان کے انبیاء کے لئے "مذاہب" کا پہچاننا ناممکن ہے۔

پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ ان عقائد و احکام کی برابر اشاعت و تعلیم ہوتی رہے اس لئے کہ دین کا بقاء اسی پر منحصر ہے۔

اس کے علاوہ امت محمدیؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ دنیا کی بھلائی کی تلقین (امر بالمعروف) اور برائی کی ممانعت (نہی عن المنکر) کرتی رہے، ایک آیت میں امت کی پیدائش وظہور کا مقصد بتایا گیا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ۔ (تم سب امتوں سے بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی، اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو)۔

لیکن یہ امت کا بحیثیت مجموعی فریضہ ہے، اگر اس میں سے ایک معتد بہ جماعت یہ فرض انجام دے تو گویا پوری امت یہ فریضہ انجام دے رہی ہے، اس لئے دوسری آیت میں امت کے ایک بڑے گروہ کا جس پر خود امت کا اطلاق ہو سکے یہ فریضہ بتایا گیا ہے مگر اس امت صغریٰ کا پیدا ہونا اور اس کو ان کا موقع دینا خود امت کبریٰ کا فرض قرار دیا گیا ہے فرمایا:۔

"ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔ (تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو خیر کی دعوت دے نیکی کا حکم کرے اور بُرائی سے روکے)

اس تقسیم عمل کے اصول کو یہ آیت اور زیادہ واضح کرتی ہے۔

وما کان المومنون ..... لعلھم یحذرون ۰ (اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل جائیں، تو یوں کیوں نہ کریں کہ ہر جماعت میں سے چند اشخاص نکل جائیں تاکہ دین کا علم سیکھیں اور اس میں سمجھ پیدا کریں اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئیں تو ان کو خوف دلائیں تاکہ وہ کچھ خوف کریں۔

نہایت آسانی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ بالا فرائض نظام شرعی کی حفاظت، عقائد و احکام کو اپنے مقام پر رکھنا اور ان کو تحریف و بدعات سے بچانا، شریعت کی اشاعت و تعلیم اور تبلیغ و اصلاح کے فرائض قوم کا کون سا طبقہ انجام دے سکتا ہے؟

اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ

اسلام کے نظام شرعی کی حفاظت اور اس کے لئے ایثار و قربانی صرف وہ طبقہ کر سکتا ہے جس کی ذہنی اور عملی تربیت اس کے موافق ہوئی ہو، جس کے رگ و ریشہ میں اس نظام کی محبت اور اس کا عشق و احترام پیوست ہو گیا ہو اور جس کے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں اس کا یقین اُتر گیا ہو، اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ جب اس نظام پر کوئی ضرب لگائی گئی یا اس کے خلاف کوئی سازش کی گئی تو یہی طبقہ بے چین ہوا اور سر سے کفن باندھ کر میدان میں اتر آیا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، زید شہید رحمۃ اللہ علیہ، محمد ذو النفس الذکیہ رحؒ، ابراہیم بن عبد اللہؒ کی قربانیاں اور سرفروشی اور اموی و عباسی منحرف نظام سلطنت کے خلاف تحریک جہاد، اسلامی نظام کی حفاظت کی کوششیں ہی تھیں، پھر ان خونیں معرکوں کے مظلوم شہداء اگر عالم کہلانے کے مستحق نہیں تو روئے زمین پر پھر عالم دین کہلانے کا مستحق کون ہے؟ ان کے حامیوں اور مددگاروں میں بھی سرفہرست نام امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا ہے۔

جب عباسی سلطنت کی طرف سے امت پر جبریہ خلق قرآن کا عقیدہ مسلط کیا جانے لگا اور اس خطرناک الحاد اور اس غیر اسلامی عقیدہ کے خلاف، وقت کی سب سے بڑی شہنشاہی کے مقابلہ میں حفاظت دین کے لئے جو شخص تنہا میدان میں آیا وہ جماعت علماء کا ممتاز فرد امام احمد بن حنبلؒ تھا جس کے عزم و استقامت اور ایمان کے سامنے حکومت وقت کو جھکنا پڑا اور یہ عقیدہ تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے، آج کتنے مسلمان ہیں جو اس کا مطلب بھی سمجھتے ہیں،

تیسری صدی کے آغاز میں جب عباسی سلطنت کی غفلت سے بغداد میں سخت ابتری، فسق و فجور اور بدامنی پھیلی تو دو عالموں خالد الدریوش اور سہیل بن سلامۃ الانصاری نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا اور قوت و جمعیت کے ساتھ من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ پر عمل کرنا شروع کر دیا، جس کی پاداش میں وہ دونوں گرفتار ہوئے اور قید کر دئے گئے۔

بعد کے زمانہ میں دو جلیل القدر عالم حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور امام ابن جوزیؒ نے اسلامی نظام اخلاق کی حفاظت اور مسلمانوں کی روحانی و دینی اصلاح کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں ان کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد اسلامی نظام کو اپنے مرکز اصلی پر لانے کے لئے عقائد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفہیم اور صحابہؓ کے فہم کے مطابق سمجھنے کے لئے امام ابن تیمیہؒ نے جو علمی و عملی خدمات انجام دیں وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔

ہمارے ہندوستان میں اسلام کے نازک ترین دور میں جب مورخ اسلام کے الفاظ میں "عجم کے ایک جادوگر نے بادشاہ کے کان میں یہ منتر پھونکا کہ دین عربی کی ہزار سالہ عمر پوری ہو گئی، اب وقت ہے کہ ایک شہنشاہ اُمّی کے ذریعہ نبی امی علیہ الصلاۃ والسلام کا دین منسوخ ہو کر دین الٰہی کا ظہور ہو، مجوسیوں نے آتش کدے گرمائے، عیسائیوں نے ناقوس بجائیں، برہمنوں نے بُت آراستہ کئے، اور جوگ و تصوف نے مل کر کعبہ اور بت خانے کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار کیا"، تو جو مسلمان مجاہد اس "فتنۂ اکبر" کے مقابلہ کے لئے میدان میں آیا اور جس نے سلطنت مغلیہ کا رُخ ہی بدل دیا اور جس کی عہد آفریں تحریک اور انقلاب انگیز تجدید نے اکبر کے گھرانے میں عالم گیر جیسا متشرع فرماں روا اور حامی دین پیدا کیا وہ علماء ہی کا سرتاج مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی تھا رحمۃ اللہ علیہ۔

اس کے بعد آج اس وقت تک ان عجمی دیار میں اس غریب الوطن عربی مہمان کی جس نے سرپرستی اور حفاظت کی اور ہوا کے طوفانوں میں اس چراغ کو جو بارہا چراغ سحری بنا، گُل نہ ہونے دیا، وہ علماء دہلی کا مشہور بابرکت خاندان ہے جس میں شاہ ولی اللہ صاحب اپنے مجددانہ علمی کارناموں اور ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اپنی قربانی اور سرفروشیوں کی بنا پر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ بھی حفاظت دین اور رد بدعات، اصلاح رسوم اور الحاد و زندقہ کے مقابلہ کا جتنا کام اس وقت تک ہوا اور اس وقت بھی ہو رہا ہے دوسرا سرا اسی طبقے سے ہو رہا ہے۔

اگر دین اور اس کے شرعی نظام کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کو محض ایک قوم بن کر نہیں بلکہ ایک صاحب شریعت و کتاب قوم بن کر رہنا ہے تو مذہب کے محافظین و عاملین اور شریعت کے ترجمان و شارحین کی ضرورت ہے، اور اگر ان کی ضرورت ہے تو لامحالہ ان مرکزوں اور اداروں کی ضرورت ہے، جو ایسے اشخاص پیدا کر سکتے ہیں اور یہ ضرورت مسلمانوں کی ہر قومی ضرورت سے اہم ہے۔

خلافت راشدہ کے طرز کی اسلامی سلطنت میں بھی دینی مدارس اور تربیت گاہوں کی ضرورت ہے تاکہ امت کے اسلامی جسم میں ہر دم تازہ خون پہنچتا رہے، اہل نظر جانتے ہیں کہ جس نظام کی پشت پر ایسا ادارہ یا تربیت گاہ نہ ہو جو اس قسم کے اشخاص پیدا کرتا رہے جو اس نظام کو چلا سکیں، اگلوں کی جگہ لے سکیں، اور اس مشین میں فٹ ہو سکیں اس نظام کی جڑیں ہمیشہ کھوکھلی اور عمر ہمیشہ کم ہوتی ہے۔

اگر برائے نام اسلامی سلطنت بھی ہے تو بھی ایسے اداروں کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کو اپنے ذمہ دارانہ عہدوں کے لئے دیندار، امین اور مسلمانوں کی ضرورت سمجھنے والے کارکن مل سکیں۔

لیکن اگر کسی ملک میں بد قسمتی سے اسلامی حکومت نہ ہو تو وہاں ایسے اداروں کی ضرورت شدید تر ہو جاتی ہے، اگر کوئی جماعت کسی صحیح اسلامی حکومت کی کچھ نہ کچھ قائم مقامی کر سکتی ہے اور حفاظت دین کا فریضہ انجام دے سکتی ہے تو وہ صرف جماعت علماء ہے چنانچہ اسی نکتہ کی وجہ سے اسلامی سلطنت کے زوال کے وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان نے اسلامی تعلیم اور دینی درس و تدریس کا نظام قائم کیا جس نے بڑی حد تک ایک اچھی اسلامی ریاست کی دینی ضرورتیں پوری کیں، اہل بصیرت جانتے ہیں کہ عملی حیثیت سے اسلام ہندوستان میں ان ممالک سے بہتر حالت میں ہے جہاں برائے نام اسلامی سلطنت موجود ہے مگر دینی آزاد مدارس کا کوئی نظام یا خاندان ولی اللہی کی شان کے علماء نہیں پیدا ہوئے۔

جب ہندوستان میں حکومت مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا اور مسلمانوں کا سیاسی قلعہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تو بالغ نظر اور صاحب فراست علماء نے جابجا اسلام کی شریعت و تہذیب کے قلعے تعمیر کر دیئے، انہی قلعوں کا نام عربی مدارس ہے، اور آج اسلامی شریعت و تہذیب انہیں قلعوں میں پناہ گزیں ہے اور اس کی ساری قوت و استحکام انہی قلعوں پر موقوف ہے۔

بقیہ ص۵: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

یا موجب خطر سمجھتے ہوں ان پر بھی آپ بلا تکلف تنقید فرمائیں، میں نے کبھی اپنے کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا نہ میں اس پر بُرا مانتا ہوں، البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ میں ہر تنقید کو برحق مان لوں، اور ناقدین کے بیان کردہ خدشات اور اندیشوں کو صحیح تسلیم کر لوں۔"

خاکسار

ابوالاعلیٰ

وہ اس دنیا میں نہیں ہیں، میں اظہار خیال، دینی صلاح و مشورہ اور فکر و فہم کے اس قدرتی تنوع کے حق کو محفوظ رکھتے ہوئے (جو ہر صاحب فکر بلکہ طالب علم کا حق ہے اور جس کا اظہار تاریخ اسلام کے ہر دور میں ہوتا رہا ہے) بحیثیت مصنف، متکلم، مفکر اور داعی کے ان کی امتیازی و انفرادی خصوصیات اور بڑائی کا نہ صرف فراخ دلی بلکہ مسرت اور بہت سے مشترک روابط و خصوصیات کی بنا پر ایک گونہ فخر کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی اسلامی خدمات کا پورا صلہ عطا فرمائے، ان کی ان لغزشوں سے جن سے نبی معصوم کے سوا کوئی فرد بشر خالی نہیں در گزر فرمائے اور امت مسلمہ کو اس دور میں ایسے عالی دماغ اور بلند پایہ مصنف و مفکر عطا فرمائے جیسا کہ ہر دور میں عطا کرتا رہا ہے۔

"اللّٰھم اغفر لہ ولا تفتنا بعدہ"

براہِ کرم مراسلت کے وقت خریداری نمبر تحریر کرنا نہ بھولیں

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مَرحُوم

مولانا شمس تبریز خاں صاحب

●

دبستان ندوہ میں ابھی مولانا محمد الحسنی اور مولانا اسحاق جلیس کا غم تازہ ہی تھا کہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے بھی داغ مفارقت دیا اور ندوۃ العلماء و دارالمصنفین کی علمی، ادبی اور دینی محفلوں میں اندھیرا ہو گیا۔ مولانا مرحوم عمر بھر دینی و علمی کاموں میں فعال و سرگرم رہے اور کبھی سستی و کاہلی کو پاس پھٹکنے نہیں دیا، کبھی سستانے کا نام نہیں لیا، بیمار رہنے کے باوجود بیمار نہیں بنے اور ایک مشین کی طرح اپنا کام نہایت خاموشی اور مستعدی کے ساتھ انجام دیتے رہے اور بالآخر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو کر اپنے مالک سے جا ملے۔

وہ جہاں اور جس ماحول میں بھی رہے فطرت کا عطیہ بن کر رہے، ہوا، پانی، روشنی سے ہم سب فائدہ اٹھاتے ہیں مگر انکے سہل الحصول ہونے کی وجہ سے ان کی قدر اور شکر کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ البتہ ان کی نایابی کے وقت زندگی میں ان کی اہمیت اور قدر و قیمت محسوس ہوتی ہے۔ مولانا عبدالسلام قدوائی کی گرانمایہ ہستی بھی فطرت کا ایک عطیہ و احسان معلوم ہوتی تھی جس سے ہر شخص ہر وقت فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ انہوں نے اپنی فیاض طبیعت اور بلند فطرت کے سبب خود کو ایسا "سر منفعت نظر" بنا دیا تھا جو 'چشم خریدار' پر کسی قسم کا احسا بھی رکھنا گوارا نہ کرتا تھا۔

اس پُر آشوب دور میں جبکہ اخلاقی قدریں یکے بعد دیگرے پامال ہوتی جا رہی ہیں، اور اگلی شرافت و مروت، بزرگانہ شفقت و عنایت، ایثار و قربانی، اخلاص و للّٰہیت اور تواضع و خاکساری کے نمونے نایاب ہوتے جا رہے ہیں وضعدار بزرگوں، اور بلند اخلاقی اقدار و معیار کی حامل شخصیتوں اور باعمل عالموں کا اٹھ جانا کوئی معمولی خسارہ نہیں جس کی جلد تلافی ہو سکے۔ مولانا قدوائی مرحوم اپنے علمی کمالات کے ساتھ ایسے بلند اخلاقی صفات کے بھی حامل تھے جن کی یاد ان کے دوستوں، عزیزوں اور واقف کاروں کو برابر آتی اور دل میں کسک پیدا کرتی رہے گی، ان کے سارے علمی و عملی کمالات پر بے تکلفی و بے تصنعی، خاکساری اور فروتنی کا پردہ پڑا رہا جس کے سبب سے ظاہر بیں نگاہیں ان کے مقام و مرتبہ کو آسانی سے نہیں دیکھ سکتی تھیں، وہ من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ کی ایک تفسیر اور تعبیر تھے۔ انہوں نے جتنی تواضع اختیار کی، اللّٰہ تو نے اس سے کہیں زیادہ انہیں عزت و مقبولیت عطا کی۔

انکسار و تواضع اور سادگی و بے تکلفی ان کی سیرت کے بنیادی عناصر تھے جنھوں نے ہر طبقے میں انھیں محبوبیت و مقبولیت دلائی تھی، تواضع کی یہ حد تھی کہ وہ اپنے شاگردوں کے سامنے بھی اپنی کم علمی کا برملا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے اور کہتے کہ بڑوں کی موت نے ہمیں بڑا بنا دیا۔

وہ طالب علم اور استاذ کا تعلق خونی رشتے سے بڑھ کر سمجھتے تھے جس کے شاہد انکے وہ مضامین ہیں جو انہوں نے ابھی حال میں معارف میں اپنے استاد و مربی مولانا حیدر حسن خاںؒ اور مولانا شبلی فقیہ وغیرہ پر لکھے تھے اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ اپنے اساتذہ اور اپنے عہد طالب علمی کی ایک ایک بات کو بڑی حسرت سے یاد کرتے اور دوسروں کو لطف لے لے کر ان کے تذکرے سناتے۔ خاص طور پر حضرت مولانا علی میاں صاحب اور مولانا مرحوم جب اپنے مشترک اساتذہ و احباب کا باہم تذکرہ کرتے سننے والوں میں بھی ان ہستیوں کے دیکھنے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کی حسرت و تمنا پیدا ہو جاتی اور عہد رفتہ آنکھوں میں پھرنے لگتا تھا۔

وہ اپنی تقریروں اور تحریروں کے علاوہ گفتگوؤں میں بھی اپنے اساتذہ و اکابر کے گزرے ہوئے زمانے کو اسی ذوق و شوق سے آواز دیتے جس نے نظیری کو یہ کہنے پر مجبور کیا تھا کہ ؎

داستان عہد گل را از نظیری بشنو
بلبلاں آشفتہ تر گفتند ایں افسانہ را

وہ جیسا تعلق اپنے اساتذہ سے رکھتے تھے ویسا ہی اپنے تلامذہ سے بھی، وہ ان سے صرف قانونی اور ضابطے کا تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ انکے دکھ درد میں شریک ہوتے اور ان کا رازدار و غمگسار بن جاتے تھے اسی لئے ان کے تلامذہ اور اہل تعلق بھی ان پر پورا اعتماد کرتے اور ان کے مشوروں پر ان کے اخلاص و دلسوزی کے سبب عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے اپنی تقریر و تحریر دونوں ہی میں اپنی فطری سادگی و بے تکلفی برتتے تھے جس سے ایک خاص اثر پیدا ہو جاتا تھا اور وہ ان کے دل سے نکل کر قارئ و سامع کے دلوں میں گھر کر لیتی تھیں، انھیں تقریر و تحریر پر یکساں قدرت حاصل تھی جس میں اخلاص کی گرمی، جذبے کی شدت اور خیرخواہی کا انداز غالب رہتا تھا اور کام کی باتیں کام کی زبان میں بغیر کسی حاشیہ آرائی اور تمہید کے رکھ دیتے تھے۔

مولانا کا ایک خاص وصف ان کی کشادہ ذہنی اور کشادہ قلبی بھی تھی جو سیر و سفر اور مختلف حالات اور تحریکات اور اداروں میں رہنے اور طویل تجربات کا نتیجہ تھی وہ ایک کہنہ مشق صحافی بھی تھے اور ایک عرصے تک بمبئی میں اپنے رفیق درس مولوی رئیس احمد جعفری ندوی کے ساتھ اخبار "خلافت" بمبئی میں رہے پھر حضرت مولانا علی میاں صاحب کے ساتھ ماہنامہ "الندوہ" کے دور ثالث میں مدیر رہے، پھر انہی کے اشتراک سے ہفت روزہ "تعمیر" لکھنؤ کے مدیر رہے، جامعہ کے رسالہ "اسلام اور عصر جدید" کے ادارتی عملہ میں ان کا نام شامل تھا اور اس میں انہوں نے مسلم مسائل پر بڑے فکر انگیز مضامین لکھے، اور اب موقر ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ کی ادارت میں محترمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے شریک کار تھے اور اس میں بھی ہندوستانی مسلمانوں کے چند اہم اور حل طلب مسائل، اردو، مسلم یونیورسٹی، مسلم پرسنل لا، اور فرقہ وارانہ فسادات پر انہوں نے شاہ معین الدین ندوی مرحوم کے پُرخلوص انداز میں کئی اداریے لکھے تھے اور مسلمانوں کو ان کی ملکی و ملی ذمہ داریاں یاد دلائی تھیں جو ان کے "جرأت" بھرنے کا تقاضا ہیں۔

تاریخ و اقتصادیات کا خصوصی مطالعہ کرنے اور حساس دل و دماغ رکھنے کے سبب وہ حالات حاضرہ، سیاسی تغیرات و انقلابات، اور مستقبل کے امکانات سے پوری طرح باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے اور حقائق کی سنگینی کو تسلیم کر کے ان کے علاج پر غور کرتے تھے۔ معاشی مشکلات اور پیچیدگیوں سے بھرے ہوئے حالات میں علمی دینی کام کرنے والوں کی ذمہ داریوں اور مجبوریوں کو وہ خوب سمجھتے تھے اور اس سلسلے میں بڑا کھلا ذہن رکھتے تھے اور ان کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔

منجھے ہوئے اور پختہ کار صحافی ہونے کے ساتھ وہ تقریب ایک درجن چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سبھی بڑے کام کی اور عوام و خواص سب کے لئے کارآمد ہیں۔ آزادیٔ ہند کے بعد ۱۹۴۸ء میں حضرت مولانا علی میاں صاحب اور انہوں نے اخبار "تعمیر" کے ساتھ ادارۂ تعلیمات اسلام کے نام سے ایک تعمیری ادارے کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں عربی زبان اور قرآن مجید کا ذوق پیدا کرنا تھا، یہ ادارہ اپنے مقصد میں بہت کامیاب رہا، یہاں انہوں نے 'تعلیمات اسلام' عربی زبان کے دس سبق، اور قرآن کی پہلی، دوسری اور تیسری کتاب لکھی، 'ہماری بادشاہی' کے نام سے مختصر تاریخ اسلام اور 'ہندوستان کی کہانی' کے عنوان سے مختصر تاریخ ہند لکھی، ان کی دوسری کتابوں میں 'مثالی حکمراں' بہت قیمتی کتاب ہے جس میں انہوں نے خلفائے راشدینؓ کی مثالی سیرت کی جھلکیاں پیش کی ہیں، اور کتابوں میں حدیث نبوی کے پانچ اولیں صحیفے، مولانا حیدر حسن خاں، اور دنیا اسلام سے پہلے اسلام کے بعد ہیں، اعلیٰ تحریری صلاحیت کے باوجود انہوں نے کم لکھا، غالباً ان کی کوتاہ قلمی میں ان کے طبعی انکسار کو دخل تھا جس سے ان کو خیال ہوتا ہوگا کہ اگلوں نے پچھلوں کے لئے کوئی موضوع چھوڑا ہی کہاں ہے (کم ترک الاول للآخر) دوسری وجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ دینیات کی مصروفیات بھی رہی ہوں گی۔

مولانا کی تحریر، مولانا سید سلیمان ندوی کے اسلوب سے قریب تھی اور اس میں اختصار و جامعیت، حشو و زوائد سے پرہیز، کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب کی گنجائش اور روانی و دلکشی بھی موجود ہوتی تھی جس کا ایک چھوٹا سا نمونہ ان کا وہ مقدمہ بھی ہے جو انہوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سفرنامۂ مراکش پر لکھا تھا، اس میں مراکش پر میرا ایک مضمون بھی شامل ہے، مولانا نے اس کی بعض کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی جس سے ان کی تاریخ پر گہری نظر اور تصنیفی مہارت کا اندازہ ہوتا تھا۔

آخر میں مولانا مرحوم سے اپنے ذاتی تعلقات کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں ان سے سب سے پہلے ان کی کتاب "مثالی حکمراں" اور "ہماری بادشاہی" کے ذریعہ واقف ہوا، پھر ندوۃ العلماء میں قیام کے بعد ان سے راہ و رسم بڑھی، جب بھی ملاقات ہوتی تو بڑے خلوص سے خیریت و حالات پوچھتے، لکھنے پڑھنے کی کیفیت معلوم کرتے اور مستقبل کے بارے میں مشورے دیتے اور شفقت فرماتے تھے۔

میری ناچیز تحریروں پر اظہار خیال کرتے اور اس سلسلے میں مفید مشورے دیتے اور ترقی کے خواہاں رہتے تھے۔ مجموعی طور پر ہر لحاظ سے ان کی ذات تقویت و طمانینت کا باعث اور ان ہستیوں میں تھی جن کے سایے میں آدمی اپنی تھکن بھول جاتا ہے اور اگلی منزلوں کے لئے حوصلہ ملتا ہے اور جن کو کھونے کے بعد انسان کو کہنا پڑتا ہے کہ ؎

اب سایۂ و ثمر کی توقع کہاں رہے
سوکھے ہوئے شجر ہیں سرِ رہگذار لوگ

مولانا مرحوم اپنی سادگی و صفائے باطنی، خیرخواہی و اخلاص، علم دوستی اور دینی خدمت، شرافت و وضعداری ہر لحاظ سے ان مغتنم ہستیوں میں تھے جو رفتہ رفتہ ناپید ہوتی جا رہی ہیں اور جن کے نمونے کمیاب ہوتے جا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی علمی، دینی خدمات اور ملت اسلامیہ کے لئے مخلصانہ جذبات کو قبول کرتے ہوئے انکی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ہمیں ان کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین

* *

بقیہ صفحہ ۱۲: اخوان پر سادات کا غصہ

کہ تم لوگ موجودہ نظام کے مخالف عناصر کے ساتھ مل کر خفیہ جلسے کرتے ہو اور کمیونسٹ اور قدیم وفد پارٹی کے ساتھ ساز باز کرتے ہو۔

آخر میں سادات نے عمر تلمسانی کو گفتگو کی اجازت دے دی وہ کھڑے ہوئے اور اپنے سنبھالا اور مائک تک پہونچے اور جذباتی انداز سے گفتگو کرنے لگے، ان کے دونوں ہاتھ بہت تیزی سے اوپر نیچے ہو رہے تھے انہوں نے مصری اخوان کی جانب سے مدافعت کرتے ہوئے کہا جہاں تک سازش کا تعلق ہے میں کہتا ہوں اے انور سادات، کمیونسٹوں نے متعدد بار مجھ سے ملاقات کرنی چاہی لیکن میں نے سیاسی ملاقات سے انکار کر دیا۔ پھر مجھ کو برطانوی سفارت خانہ مقیم قاہرہ نے یہ پیغام پہونچایا کہ برطانوی وزارت خارجہ کا ایک سرکاری وفد مصر کا دورہ کرنے والا ہے وہ آپ سے ملاقات کا خواہشمند ہے، میں نے اس سے معذرت کر دی کیونکہ بیرونی افراد کے ساتھ میں کوئی گفتگو نہیں کرتا۔ کمیونسٹ اٹارنی جنرل تھوڑے دن قبل مختلف امور پر میرے جواب چاہے لیکن معاملہ صرف جواب اور وضاحت امر تک محدود رہا۔

تلمسانی نے اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا اگر مجھ کو کوئی تکلیف پہونچتی تو میں ظالم کی شکایت آپ سے کرتا لیکن آپ سربراہ مملکت ہیں اور آپ مجھ پر ظلم کریں گے تو میں کس سے شکایت کروں گا۔ اس وقت تلمسانی نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز میں کہا تیری شکایت اللہ سے کروں گا۔

تلمسانی نے تھوڑی دیر توقف کیا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا میں نہیں جانتا کہ مجھ پر اس ملاقات کے بعد کون سی مصیبت نازل ہوگی۔

سادات تلمسانی کی گفتگو بہت ہی اہتمام و غور سے سنتے رہے اور جب انہوں نے توقف کیا تو کہا، اے عمر چھوڑو ان باتوں کو اب ہم از سر نو تعلقات کا آغاز کریں اور گفتگو ختم ہو گئی۔

● ●

لمحۂ فکر و عمل

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم

الحاد زار یورپ سے کفر و زندقہ اور بے دینی و لامذہبی کی صدائیں اٹھ رہی ہیں گو ایک عرصہ تک وہ صدا بصحرا ثابت ہوئیں لیکن بالآخر ایک عالم ان کی گونج سے پرشور ہو گیا، پہلے ہم نے دیکھا کہ ساحل باسفورس اس سے متاثر ہو رہے ہیں، پھر وادی نیل میں جنبش نظر آئی، بالآخر وسط ایشیا میں اس کے بگولے اٹھے اور آخرکار ہمالیہ کی بلند چوٹیوں سے گذر کر یہ سیلاب قدامت پسند ہندوستان میں بھی آ ہی گیا جس نے ایک محشر اضطراب اور عالم دار و گیر برپا کر دیا۔

جو کچھ ہونا تھا ہوا، حالات کی پوری تفصیل آپ کے سامنے ہے لیکن کبھی آپ نے اس پر غور کیا کہ آخر اس الحاد عام کے اسباب کیا ہیں دوسری قوموں اور جماعتوں کو چھوڑ دیجئے کہ آپ کا تعلق انسے نہیں ہے، لیکن وہ مذہب اسی کی زد میں کیوں آ رہا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا آخری پیغام ہے جو دین فطرت ہونے کا مدعی اور عالم گیر ہدایت کا دعویدار ہے، جو کہتا ہے کہ میں دین کا دائمی نظام عمل ہوں اور میرے ہی پاس تشنہ کامان صداقت کو سامان سیرابی میسر آ سکتا ہے، آخر اس دین حق کی پریشانی کے اسباب کیا ہیں۔

اسلام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالئے تو پہلے مکہ کی مقدس سرزمین پر آپ اس دعوت حق کو بلند ہوتے دیکھیں گے اور جبل ابوقبیس سے داعی حق کے پُراثر و مقدس وعظ سنیں گے، جس کی دعوت حق ہر قسم کے اختلاف زور شور کی مخالفت، انتہائی جبر و تعدی اور طاقت و قوت کی پوری نمائش کے باوجود نہ صرف مکہ نہ صرف عرب نہ صرف جوار عرب بلکہ زمین کے چپہ چپہ اور کرۂ ارض کے گوشہ گوشہ میں کامیاب ہو کر رہی، اسے نہ ابوجہل و ابولہب کی شرارتیں روک سکیں، نہ طائف و مکہ کے رئیسوں کی سختیاں بند کر سکیں، نہ پورے عرب کا بغض و عناد سد راہ ہو سکا نہ آہن پوش فوجیں اور خوں چکاں اسلحے اس کی مخالفت میں کامیاب ہو سکے۔

اس کے بعد اصحاب باصفا کی جماعت نظر آئے گی جس نے ظاہری بے سر و سامانی اور اسباب مادی کے فقدان کے باوجود مشرق سے مغرب تک دین الٰہی کا پرچم اڑا دیا اور اس طرح کہ جس طرف نکل گئے دوستوں نے نہیں بلکہ دشمنوں نے فرشتۂ رحمت سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا جہاں چلے گئے پورا علاقہ انہیں کے رنگ میں رنگ گیا، جس جگہ بیٹھ گئے دین و مذہب، تہذیب و تمدن، لسان و آداب آنا فانا بدل گئے اور اس طرح کہ آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان میں کوئی تغیر نہ ہو سکا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے "آخر کیوں" پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے"۔ اگر سچ پوچھئے تو بات یہ ہے کہ وارثین نبوت اسوۂ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو فراموش کر چکے ہیں دین و دنیا کی جامعیت جو اسلام کا طرۂ امتیاز تھی، عرصہ ہوا مسلمانوں سے رخصت ہو چکی ہے اور اس کے بجائے چرچ و اسٹیٹ کی راہبانہ تقسیم کا رواج ہے اس تفریق نے ملت کی رگ حیات کاٹ دی ہے، زندگی کے تمام شعبے مذہبی رہنمائی سے محروم ہوتے جاتے ہیں، ضرورت ہے کہ مسلمان اب بھی اس حقیقت کو سمجھیں اور تعلیمی اداروں کے نصاب و نظام تعلیم میں انقلاب ہو۔ آئندہ نوجوانوں کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کی سیرت میں پختگی، ارادوں میں بلندی اور عمل میں استواری ہو اسلام کے بنیادی عقائد ان کے دلوں میں اس طرح اتر جائیں کہ پھر مخالفت کی آندھیاں اور کفر کے طوفان ان میں کوئی بھی تزلزل پیدا نہ کر سکے، طبیعتوں میں ایسا استحکام اور ان میں ایسا دوام ہو کہ ان کے دم سے آئندہ زندگی کی راہیں بدل جائیں، مدت کے مرجھائے ہوئے چمن لہلہا اٹھیں اور اس باغ کی خزاں پھر بہار سے بدل جائے۔

○

اخوان پر سادات کا غصہ

محمود الازہار ندوی

★

گذشتہ ماہ مصر کے صدر انور السادات نے اسماعیلیہ میں علماء سے ملاقات کے دوران ایسی دھمکیاں دیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر میں سیاسی پابندی کے ساتھ دینی پیچ کنی کا ایک نیا دور شروع کیا جائے گا۔

صدر سادات نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ جو بھی علماء دین میں سے حکومت اور سیاست سے ٹکرائیں گے وہ رحم کے قابل نہیں ہیں چاہے وہ اس کا اظہار مسجد کے منبروں پر تقریروں میں کریں یا عام گفتگو میں۔ سیاست کا دین سے اور دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سادات نے یہ باتیں اخوان المسلمون کے نمائندہ عمر تلمسانی کو پر روز انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہیں جس کے جواب میں اخوانی نمائندہ نے جوان کے سامنے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا کہا مملکت میں آپ سے برتر اور اعلیٰ کوئی عہدہ دار نہیں ہے جہاں میں شکایت کرسکوں اس لئے میں آپ کی شکایت اللہ سے کرتا ہوں اس کے جواب میں سادات نے نئے باب کے آغاز کی دعوت دی اور کہا کہ میں نے تمہارے عظیم لیڈر حسن البنا سے ہاتھ ملایا ہے۔

سادات نے علماء دین سے عجیب جذباتی انداز سے گفتگو کی، پہلے تو انہوں نے اس کے لئے اسماعیلیہ پہونچنے سے قبل اپنے دفتر اور وزارت اوقاف کے توسط سے ائمہ مساجد، علماء دین مختلف دینی جماعتوں کے رہنماؤں اور نمائندوں کی منتخب فہرست طلب کر لی تھی اور سر فہرست شیخ الازہر کو رکھا تھا اس میں شرکت کے لئے اخوان کے نمائندہ اور "الدعوۃ" کے ایڈیٹر عمر تلمسانی کو خاص طور پر دعوت نامہ بھجوایا تھا کیونکہ انہوں نے مسلسل مقالات کے ذریعہ سادات حکومت پر سخت تنقید کی تھی اور کیمپ ڈیوڈ معاہدہ جس کے نتیجہ میں مصر اور اسرائیل کا معاہدہ ہوا۔ ؟

وقت مقررہ پر علمائے دین جو مختلف شہروں اور مقامات سے تشریف لائے تھے وہ سادات کے سامنے صف بستہ موجود تھے اور صدر کرسی صدارت پر شیخ الازہر حسنی مبارک اور وزیر اوقاف اور دیگر ذمہ داروں کے ساتھ اسٹیج پر موجود تھے۔

دعوت نامے جاری کرتے ہوئے کچھ ناموں کو نشان زد کرکے تقریر کا مجاز قرار دے دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ وہ تقریر کرکے ذمہ داروں کو دکھلادیں مگر اخوان کے نمائندہ عمر تلمسانی نے معذرت کردی تھی اور مشروط طور پر برجستہ موجودہ نظام اور حکومت سے کوئی تعرض کئے کچھ باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہی۔

اکثر مقررین کی تقریروں کا مضمون یکساں تھا جن کا خلاصہ یہ تھا کہ دین وایمان پر مضبوطی سے کاربند رہیں اور بعض نے اپنی تقریریں محمد انور السادات کے لئے دعا پر ختم کی اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرے۔ ؟

پھر اخوان کے نمائندہ عمر تلمسانی کی باری آئی انہوں نے اپنی تقریر برجستہ اور پرسکون انداز میں شروع کی اور پر زور انداز میں سادات سے کہا وہ مصر اور مصر کی سیادت اور مصر کی عزت کے مفاد میں نام کریں اور سیاسی موضوعات کو چھیڑا تک نہیں۔

جب تلمسانی نے تقریر شروع کی تو سادات اپنی نشست سے اٹھ گئے اور منھ میں پائپ لگایا اور اخوان کے نمائندہ پر نگاہیں مرکوز کردیں اور حسنی مبارک ایک کاغذ پر کچھ اشارات لکھنے لگے جس کو بعد میں سادات کے سامنے پیش کردیا گیا۔

حاضرین جلسہ نے ان حالات کو دیکھ کر محسوس کرلیا کہ آج تلمسانی اور سادات کے مابین کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا سادات اپنی نشست پر آگئے اور بے چینی سے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر انتظار کرنے لگے۔

جب مقررین اپنی تقریر ختم کرچکے تو سادات نے اپنی تقریر کا آغاز اسی انداز سے کیا جیسا کہ وہ اس قسم کے موقعوں پر کرتے ہیں اور ڈیموکریسی کے دائرہ میں مشورہ اور تبادلہ خیال کی دعوت دی اور اپنے قدیم پائپ کو لئے ہوئے کہا وہ کہ ان کا بچپا کسان ہے اور گاؤں کے طور وطریقہ وعادات کا عادی ہے اور ان ہی عجیب وغریب عادات کی وجہ سے اپنے کو مصری سوسائٹی سے ہم آہنگ نہیں کرپایا ہے اور جو نوجوان ان عادات وطور طریقہ سے مستفید ہوگا وہ اپنے گھر اور حکومت دونوں سے باغی ہوگا اور یہ خرمناک بات ہے۔

سادات نے اس موقعہ پر ایک طالب علم کا واقعہ بتایا جو یونیورسٹی کے ایک جلسہ میں حد سے زیادہ جرأت وبے باکی سے پیش آیا تھا، اور وہ مجھے اب تک یاد ہے اس نے کھڑے ہوکر مجھ کو چیلنج کیا تھا، کیا تربیت اسی طرح ہوتی ہے، کیا مصری اخلاق اسی کے آئینہ دار ہیں۔ ؟

پھر وہ علماء دین کی جانب متوجہ ہوئے اور برجستہ کہا ان میں کچھ نوجوان ایسے ہیں جنھوں نے اپنی داڑھیاں بڑھا رکھی ہیں اور لوگوں میں نامعقول اور بیہودہ باتیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے پھیلا رہے ہیں۔

سادات نے اپنی تقریر میں حکومت پر مسجدوں اور عام گفتگو میں تنقید کرنیوالے علماء دین کو ہدف ملامت بنایا اور الزام لگایا کہ وہ ملک کی عزت وشہرت کو خاک میں ملانے کے لئے جانے پہچانے عرب ذرائع سے رشوت لیتے ہیں اور پر اعتماد لہجہ میں کہا میں ان سے بخوبی واقف ہوں اور ان پر رحم نہیں کھاؤنگا

انہوں نے تقریر کے دوران سعودی عرب اور صاحب ثروت افراد پر سخت حملے کئے اور عرب مخالف کاز کی قیادت کرنے کا الزام لگایا اور مراکش کے شاہ حسن پر بیت المقدس کانفرنس منعقد کرنے کے سلسلہ میں اصل تخیل کے سرقہ کا الزام لگایا اور اسکا انکشاف انہوں نے اس طور پر کیا کہ اگر مصر کسی بھی عرب اجتماع کی دعوت دیتا ہے تو وہ دوسرے ملکوں کو قابل قبول نہ ہوگا بلکہ اس کی دعوت کسی دوسرے ملک کا سربراہ دے۔

اپنی تقریر میں صدر سادات نے علماء اور دینی رہنماؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا میں نے آج ہی قرآن مجید ختم کیا ہے اور پھر علماء کی مذمت اور دھمکیاں دینی شروع کردیں اور تلمسانی کی جانب اشارہ کیا، کیا تم کو یاد ہے کہ اے عمر میں نے تمہارے لیڈر حسن البناء سے بیعت کی تھی لیکن تم لوگ بدل گئے ہو اور میں تمہارے ظاہر وباطن سے بخوبی واقف ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ اس پردہ کو سب کے سامنے چاک کردوں، تم نے مجھ سے بار بار ملاقات کی درخواست کی لیکن میں نے تم سے معذرت کردی اور میں نے تم کو اس رات اس لئے بلایا تاکہ میری گفتگو کو سب سن سکیں۔ تم نے اپنے مجلہ "الدعوۃ" کے اندر ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ C.I.A نے ممدوح سالم سے ان کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں اخوان پر پابندی کا مطالبہ کیا تھا۔ میں نے ان کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ تم سے ملیں اور کہہ دیں کہ اس قسم کی باتیں شرمناک ہیں۔

میں اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے تمہارے رسالہ کی اشاعت پر پابندی لگا سکتا ہوں اور ابتک اس کی اشاعت غیر قانونی ہے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا، سربراہ مملکت کی حیثیت سے میرے فرائض میں سے ہے کہ اس کی اشاعت پر پابندی لگادوں لیکن ایک سرپرست اور بڑے ہونے کے ناطے میں نے اس کو نظر انداز کردیا اور اس طور پر تمہارا رسالہ غیر قانونی طور پر شائع ہوتا رہا۔

اے عمر! تم اور تمہارے رفقاء حکومت پر الزام لگاتے ہیں اور سخت تنقید کرتے ہو اور بیرونی عناصر سے رابطہ قائم کرکے سازش کرتے ہو اور میرے اختیار میں ہے کہ میں تم کو جیل میں ڈال دوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں نے سیاسی قید وبند پر پابندی لگادی ہے اور اس کا دوبارہ احیا نہ کروں گا۔

اے عمر! میں جانتا ہوں اور تم کو اس کا بخوبی علم ہے کہ حکومت کیا کررہی ہے اور تم لوگ کیا کررہے ہو اور پھر ایک بار میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ یہ چیز باعث شرم ہے۔

اس وقت سب کی نگاہیں عمر تلمسانی کی جانب اٹھ گئیں وہ کانپ رہے تھے اور ہاتھ اٹھا کر بلند آواز میں کہہ رہے تھے بس سادات اور بولنے کی اجازت چاہی، سادات نے کہا تم کو موقع دیا جائے گا۔

سادات نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اخوان اور عمر پر الزام لگایا

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر)

اسپین کی اسلامی انجمن

اغراض ومقاصد

سرگرمیاں

منصوبے

اسپین کی اسلامی انجمن ایک آزاد انجمن ہے جو ایک خدائے برتر پر ایمان رکھتی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری رسول سمجھتی ہے، قرآن پاک کو ایک مکمل دستور حیات اور دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک رشتۂ اخوت میں منسلک سمجھتی ہے۔

انجمن کی تاسیس:

مخلص طلباء کی ایک جماعت نے اندلس میں اسلامی سرگرمیوں کی رفتار بڑھانے، اسلامی شعائر کی بقا، اور اسلامی مشنری کی حفاظت کے لئے ایک چھوٹا سا فلیٹ کرایہ پر لیا، ۱۹۷۱ء میں اس انجمن کو سرکاری منظوری بھی مل گئی، جس کے تحت پورا اندلس انجمن کی سرگرمیوں کا میدان ہوگا۔

تاسیس کے تین سال کے بعد انجمن کا مرکز ایسی جگہ منتقل ہوگیا، جہاں دو سو اشخاص کی گنجائش ہے اور یہ اندلس کا سب سے بڑا اسلامی مرکز ہے، اب یہ مرکز بھی نمازیوں کے لئے تنگ ہو رہا ہے اور انجمن کی آئندہ سرگرمیوں کے لئے کافی نہیں ہے۔

انجمن کے اغراض ومقاصد:

(الف) مسلمانوں کے اندر دینی شعور پیدا کرکے فہم، ایمان اور عمل کے اعتبار سے ان کا اسلام سے رشتہ مضبوط کرنا۔

(ب) اسپین میں مقیم مسلمانوں کے درمیان اخوت کے رشتہ کو پروان چڑھانا۔

(ج) تمام شعبۂ حیات میں مسلمانوں کی مدد کرنا اور خالص اسلامی زندگی کی راہ میں حائل ہونے والی مشکلات کا مناسب حل پیش کرنا۔

(د) عالم اسلام کے تمام بالذات اسلامی اداروں، تحریکوں اور مخلص کارکنوں کا تعاون کرنا۔

انجمن کی سرگرمیاں:

۱۔ اسلامی شعائر کو از سر نو زندہ کرنا۔

۲۔ اسلامی مشنری میں دینی شعور پیدا کرنا، اس کا طریقۂ کار مندرجہ ذیل طریقہ پر ہے:۔

(الف) ہفتہ وار فکر اسلامی سیرت، فقہ اور توحید کا درس۔

(ب) دینی کتابیں، میگزین اور پمفلٹ (کتابچہ) وغیرہ کی تقسیم۔

(ج) انجمن ایک عربی میگزین نکالتی ہے جس کا نام "العروۃ الوثقیٰ" ہے۔

(د) انجمن اسپینی زبان میں "الاسلام" کے نام سے ایک میگزین نکالتی ہے۔

(ھ) انجمن کی طرف سے گرمی کی فرصت میں اسپین کے تمام مسلم طلباء کا ایک اجتماع ہوتا ہے۔

(و) ماہانہ، عرب طلباء کے لئے جلسوں اور اسپینیوں کے لئے لکچر کا انتظام ہوتا ہے۔

(ز) ٹیلیویژن، ریڈیو اور میگزین کے ذریعہ اسلامی مسائل کی تشریح کی جاتی ہے۔

۳۔ صوبائی مراکز کو اس کی ضروریات کے مطابق، دینی کتابوں، کتابچوں اور ماہانہ نماز کے لئے بنے ہوئے کلنڈر کی فراہمی۔

۴۔ ثقافتی اور دینی ادارے

۵۔ نئے طلباء اور اسپینی مسلمانوں کے لئے عربی اور اسپینی زبان میں، زبان کی تعلیم کا انتظام۔

۶۔ نئے طلباء اور یونیورسٹی سے متعلق طلباء کے لئے عملی اسباق کا انتظام۔

۷۔ اسلام مشنری کی خدمت اور پیش آنے والی مشکلات کا حل کرنا۔

(الف) شریعت اسلامی کے مطابق نکاح، طلاق کے معاملات حل کرنا۔

(ب) انجمن اس بات کی کوشش کررہی ہے کہ "مدرید" کے نزدیک قبرستان کی تولیت اس کے سپرد کردی جائے تاکہ اسلامی طریقہ کے مطابق مسلمانوں کی تجہیز وتکفین کا انتظام ہو سکے۔

ترجمہ: محمد صدر الحسن ندوی

انجمن کے ماتحت ادارے:

(الف) اس انجمن کے تحت مسلمان اطباء کی ایک انجمن ہے، جس کا نام "جمعیۃ الأطباء المسلمین" ہے۔ یہ انجمن مسلمانوں کی طبی امداد کرتی ہے اور طلباء کو اس کی عملی مشق کراتی ہے اور مختلف موضوعات پر لکچر کا انتظام کرتی ہے۔

(ب) "رابطۃ الطلبۃ المسلمین" یہ ایک انجمن ہے جو مسلمان طلباء کے درمیان رشتے کو مضبوط کرنے اور ان کے درمیان اخوت وبھائی چارگی کی فضا قائم کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے، رہائشی مکان لینے یا یونیورسٹی میں داخل ہونے والے نئے طلباء کی بھی امداد اسی کے ذمہ ہے۔

انجمن کے منصوبے:

(الف) مسلمان لڑکوں کے لئے ایک مدرسہ کی تاسیس۔ چونکہ انجمن کے مرکزی علاقہ میں تین سو اشخاص قیام کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان کے بچوں کو عربی اور دینی تعلیم دلانے کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔

(ب) ایک قبرستان ہے جو "مدرید" سے بیس کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، انجمن اس بات کی کوشش کررہی ہے کہ اس مسجد کے سپرد اس کی تولیت کردی جائے۔

(ج) انجمن، مملکت سعودیہ عربیہ کے سفارت خانہ کے ذریعہ اس بات کی کوشش کررہی ہے کہ مسجد کے لئے ایک قطعہ ارضی ہاتھ آجائے۔ ۱۹۷۲ء میں اسپین کے بادشاہ خوان کارلسوس نے امیر فہد ابن عبد العزیز کو مسجد کی تعمیر کے لئے ایک قطعہ ارضی دیا تھا معلوم نہیں کہ کیا بات پیش آئی کہ آج تک مسجد کی تعمیر نہ ہو سکی۔ (الدعوۃ۔ ریاض)

بقیہ صفحہ ۹: غیر مذہبی، عربی تعلیم

اس دلیل کا جواب ایک تحقیرانہ ہنسی کے سوا کچھ اور نہیں دے سکتا، حدیث تو یہ ہے کہ ایک شخص نے بارگاہ رسالت میں آکر دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے اسلام سے پہلے جو گناہ کئے تھے کیا اسلام کے بعد بھی وہ گناہ باقی رہیں گے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام اپنے سے پہلے کام کو ڈھا دیتا ہے یعنی اسلام سے پہلے جو کچھ برے کام جہالت اور نادانی سے ہوئے تھے وہ سب منہدم ہو جائیں گے اور اب اسلام کے بعد سے مسلمان کی نئی زندگی شروع ہو گی، اس حدیث کو اسلام سے پہلے کی عمارتوں اور مکانوں کے انہدام کے حکم سے کیا تعلق؟

یہ باتیں مثال کے طور پر لکھی گئی ہیں، ورنہ غیر مذہبی عربی تعلیم کے برے نتائج ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتے ہی رہتے ہیں، آج بعض انگریزی کالجوں میں عربی تعلیم جس طرح دی جارہی ہے، اس کا منشا کتنا ہی عمدہ ہو مگر مذہبی نقطۂ نظر سے وہ ہمارے کام کی چیز نہیں، اور اس کے بھروسہ پر ہم کو اپنی درسگاہوں سے تغافل نہیں برتنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ اسکولوں اور کالجوں اور مشرقی امتحانوں کی عربی تعلیم میں بھی مذہبی رنگ لگ پائے۔